TEXT LIGHT
WITHIN THE BOOK
ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222129
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ح۳۳۳ Accession No. ۷۰۹۲

Author ابوالمعانی ا - م

Title مرزی سیاح کی ڈائری کے چند صفحے

This book should be returned on or before the date last marked below.

مغربی سیاح کی ڈائری

کے

چند صفحے

از خامہ

مولانا ابو المعانی

سابق جوائنٹ ایڈیٹر اخبار خطیب

باہتمام ملا محمد الواحدی سنہ ۱۳۳۶ھ

درویش پریس دہلی میں چھپی و شائع ہوئی

قیمت علاوہ محصول ڈاک [illegible] آنے

ضروری گذارش

یہ تحریر جو اب کتاب کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے، پہلے ایک مسلسل مضمون کی حیثیت سے اخبار خطیب دہلی میں شایع ہوئی ہے، اس کے لکھنے والے مولٰنا ابوالمعانی (سابق جوائنٹ ایڈیٹر اخبار مذکور) ہیں، اُنہوں نے اس میں ہوم رول کی تحریک کو مسلمانوں کے لیے مضر بتایا ہے، اور پہلے خطیب کا بھی یہی خیال تھا، لیکن کچھ عرصہ سے خطیب ہوم رول کا حامی ہو گیا ہے، میری رائے ہے کہ ناظرین مولٰنا ابوالمعانی یا خطیب کی پچھلی پالیسی کے ساتھ خطیب کے موجودہ بیانات کو بھی دیکھیں، اور اس بارۂ خاص میں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی سعی کریں،

مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا صفحہ

غالباً میری سیاحت ہند اور سیاحت ہند کیا سارے کرۂ ارض کی سیاحت نامکمل ہی جانے گی۔ اگر میں ہند کے نظام سلطنت کے متعلق کوئی گفتگو نہ کروں۔ کیونکہ ساری دنیا کی سیاحت میں جو سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز مجھ کو نظر آئی۔ وہ یہی تھی۔ کہ ہند کا نظم و نسق کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے اصول کیا ہیں۔ اور اس کا کیا اثر پبلک پر پڑتا ہے۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ یہ حصہ میرے سفرنامہ کا بعض احباب کو خشک و بے رنگ نظر آئے گا۔ لیکن بحیثیت ایک ایسے سیاح ہونے کے جس کا تعلق سلطنت سے بھی اسی درجہ کا ہے جس درجہ اسکو پبلک سے وابستگی ہے۔ میرا یہ فرض ہے۔ کہ اس پر ایک بسیط گفتگو کروں اور اپنی معلومات کے اس حصہ میں جگہ دوں جو باعتبار اپنے نتائج کے گو زیادہ اہم نہیں۔ لیکن عجیب و غریب ضرور ہے۔

میں یہ پہلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔ کہ ہند کی یہ عجیب خصوصیت کہ وہاں کا ہر آدمی ایک نیا رنگ و مزاج ایک جداگانہ مذاق و طبیعت رکھتا ہے اور کہیں نہیں پائی جاتی لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز امر میں اب بیان کروں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں میں نے وہاں کی سیاحت کی تو معلوم ہوا کہ باوجود اس تضاد طبائع اور اس

تخالف امزجہ کے وہاں ایک مخلوط گورنمنٹ ہے جس میں سرد و گرم، خشک و رطب کے مختلف المزاج والے لوگ اسی طرح ملے ہوئے ہیں، جس طرح ہمارے ملک میں اضداد عنصری کے اصول پر علم کیمیا کے جاننے والے مختلف مزاج کے مادوں کو مخلوط کر کے ایک شیشہ میں بند کر دیتے ہیں۔ اور پھر وہ شیشہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اس گورنمنٹ کو جس کی ترکیب کو سوائے اس کے کہ قدرت خداوندی کا ایک معونہ کہا جائے، اور کچھ نہیں سمجھا سکتا، ہند کے لوگ اپنی زبان میں نہیں۔ بلکہ اس زبان میں جس کے بولنے والے اک دوسرے اور بہت بعید ملک کے رہنے والے ہیں (یہ دوسری عجیب بات ہے) سلف گورنمنٹ کہتے ہیں۔ آپ لوگ متحیر ہونگے۔ کہ یہ کیا بلا ہے۔ اور افسوس ہے کہ میں بھی اسقدر جلد آپ کی حیرت و استعجاب کو نہیں مٹا سکتا۔ کیونکہ اس کے سمجھانے کے لیئے مجھے تاریخ ہند کے بہت سے پچھلے صفحات پلٹ کر آپ کے سامنے رکھنے پڑیں گے جسطرح مجھے اول اول خود سمجھنے میں کرنا پڑا تھا۔ اور پھر کچھ کچھ آپ جان سکیں گے۔ کہ یہ سیلف گورنمنٹ کیا چیز ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے، کہ اس سیلف گورنمنٹ کی بنیاد کو پڑے ہوئے، ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ صحیح معنے میں۔ تو وہ اسی سال ملی ہے جس سال میں وہاں بغرض سیاحت پہنچا تھا، اب سے کوئی چالیس سال پہلے سلطنت کا نظم اس صورت پر نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اس کا طریقہ دوسرا تھا۔ اب تو یہ ہے۔ کہ تمام معاملات خواہ ان کا تعلق داخلی انتظام سے ہو یا خارجی سے خود ملک کے لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کرتے ہیں، اور پہلے یہ تھا۔ کہ ایک اور قوم یورپ کی رہنے والی تھی اور جس کا اب بھی بہت کچھ اقتدار و انتظام ہند میں ہے، خود سارا انتظام کرتی تھی اور ملک کے کسی آدمی کو اس میں دخل نہ تھا۔ مالگزاری کا وصول کرنا۔ اس کے اخراجات کی مدیں قایم کرنا، محکمہ جات میں تہذیب و ترتیب کی غرض سے سارا عزل و نصب وغیرہ اسی قوم کے ایک سب سے زیادہ دانشمند ہاتھ میں ہوتا تھا جس کو وایسرائے کہتے تھے اس وایسرائے

کے ماتحت قریب قریب دہی اختیار رکھنے والے چار پانچ لوگ اور ہوتے تھے جنکو لفٹننٹ گورنر کے نام سے پکارتے تھے ، وائسرائے اور لفٹننٹ گورنروں کے ہاں مجالس شورائے بھی تھیں جنکو وہ کونسل کہتے تھے ، اور اسمیں خاص ہندوستان کے بھی دو چار لوگ بہ حیثیت مشیر رہا کرتے تھے ۔ لیکن سنا ہے کہ ان مجالس میں کبھی کوئی فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس میں ہندوستان کے مشیروں کے جذبات و داعیات کا لحاظ کیا گیا ہو ۔ جب اس حالت کو قائم ہوئے ، اک زمانہ ہو گیا ۔ تو ہندوستان کے اصلی باشندوں نے اس بات کو اول اول محسوس کیا ۔ کہ شاید اجلے رنگ کی حکومت شیام رنگ کی رعایا کے ساتھہ پورا انصاف کرنا پسند نہیں کرتی ۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں ۔ کہ ہمیں پورا ورخور انتظامی معاملات میں حاصل نہ ہو ۔ اور بعض عہدے جنکا تعلق براہ راست پبلک کی رفاہ سے ہے ہم کو نہ عطا ہوں یہ ایک خیال تھا ۔ جو بعض بعض دماغوں میں پیدا ہوا ۔ اور وہیں دفن ہو کر رہ گیا ۔ چونکہ اس قوم کو محکومیت کی حالت میں بسر کرتے ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا ۔ اور اس یورپ سے سے آنے والی قوم کی حکومت سے پہلے بھی وہ صدیوں تک اس قوم کی حکومت برداشت کر چکی تھی ، جو اب محکومی میں اس کے دوش بدوش ہے ۔ اس لیئے ان کے فاتحانہ جذبات اک حد تک فنا ہو چکے تھے اور اس لیئے اس قوم کے دانشمندوں کا یہ خیال تھا ۔ کہ اگر ہماری ساتھی قوم بھی اس خیال کی پرورش اپنے دماغ میں کرے تو زیادہ کامیابی کی امید ہے ۔

غالباً اس جگہ یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا ۔ کہ ان دونو قوموں میں باوصف اس کے کہ صدیاں ساتھہ ساتھہ رہتے گذر گئی ہیں ، لیکن پھر بھی زمین آسمان کا تفاوت ہے باعتبار مذہب تو ضد ہوئی ہی ہے ، کیونکہ اگر ایک بت گر ہے تو دوسرا بت شکن ۔ ایک اگر ہر سنگ دل سے چکنے پتھر کے سامنے سر جھکا دینا اپنا فرض سمجھتا ہے ۔ تو دوسرا باوصف اس اعتراف کے بھی ایک خدا کا ماننے والا ہے ، اپنی گردن مشکل سے عدالت کے سامنے بھی خم کرلیے

لیکن تمدن و معاشرت کے لحاظ سے بھی ان دونوں قوموں میں بون بعید ہے، اور اس
کی وجہ کھلی ہوئی ہے، کیونکہ ہر قوم کا مذہب اس قوم کا اصلی کیرکٹر بنانے والا ہے، اور
جب مذہبوں میں اختلاف ہوگا، تو کیرکٹر میں اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ بہرحال وجہ
کچھ بھی ہو۔ کیونکہ ہم لوگ دنیا کے معاملات پر سوائے اظہار واقعات کے اور کوئی رائے زنی
کرنے کا حق نہیں رکھتے، اس اختلاف کیرکٹر کو بھی میں نے وہیں کے لوگوں سے سنکر
بیان کی ہے۔ ورنہ آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں بننے کے لیئے کسی تدریجی ارتقار
کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے یہاں اس امر کیطرف اس لیئے سرسری اشارہ کر دیا۔ کہ اپنی جگہ پر صفحات
گذشتہ میں یہ ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ کرہ ارض میں انسان کا بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ
بالکل ہی کا ایک مضغہ گوشت ہوتا ہے، اور اس کو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جب کہیں
جاکے برسوں میں وہ اس قابل ہوتا ہے۔ کہ کچھ سمجھ بوجھ سکے۔ برخلاف ہمارے ملک مریخ
کے۔ کہ یہاں طفلی شباب و شیب کا کوئی مفہوم نہیں ہے، اور شروع سے آخر تک وہ ایک
ہی عمر میں اپنی زندگی کاٹ دیتا ہے۔ بہرحال جو سبب بھی ہو، ان دونو قوموں کے طبائع میں
بہت تفاوت ہے۔ اگر ایک [illegible] ہے۔ تو دوسری [illegible] تھی۔ اگر ایک لاپرواہ و فضول خرچ
ہے، تو دوسری ویسی ہی کفایت شعار ہے، اگر ایک جری زیادہ ہے۔ تو دوسری اتنی ہی مدبر
ہے، اور اس لیئے ان دونوں میں باہم اتفاق کا ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے لیکن بغیر دونو
قوموں کے اتفاق کے [illegible] ہو سکتا تھا۔ یہ خیال جو اس بت
پرست قوم کو پیدا ہوا [illegible] کا احساس اس وقت تک دوسری بت شکن قوم کو بالکل نہیں تھا
کیونکہ کہا جاتا ہے کہ [illegible] تھی۔ ہر چند ملک ہند کی سلطنت ہمارے
ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ لیکن دنیا میں ابھی ہمارے قوم و مذہب کی اور سلطنتیں باقی ہیں، اور
اس کا ایک سبب [illegible] کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قوم تعلیم یافتہ زیادہ
نہ تھی۔ اور [illegible] زمانہ میں [illegible]

نشو و نما پا رہا تھا۔ ایک شخص ایسا اٹھا جس نے اپنی جاہل قوم کو تعلیم کیطرف رغبت دلائی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی درس دینا شروع کیا۔ کہ جہانتک ممکن ہو۔ اس غیر قوم کی سلطنت کا ساتھ دو۔ کیونکہ اس میں فوز و فلاح ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس کا اس درس سے کیا مطلب تھا۔ گر بعض لوگ دنیا کے کہتے ہیں۔ کہ یہ صرف اس کی حکمت تھی ورنہ اس کا نصب العین بھی وہی تھا۔ جو اسی پہلی قوم کا تھا۔ بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ وہ بڑی دقتوں اور مشکلوں کے بعد۔ آخر کار اپنی قوم کو تعلیم کیطرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اسی زمانہ میں جب پہلی قوم کے جذبات ناقابل ضبط ہو گئے۔ تو اس نے اپنی ایک جماعت قائم کی اور اس کا اصل مدعا یہ قرار دیا گیا۔ کہ سلطنت موجودہ سے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا جائے۔ یہانتک کہ اس نے اس بات پر اصرار کیا جائے۔ کہ ملک کا انتظام خاص ملک والوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے اور خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے۔ دوسری قوم نے اس جماعت کے مقاصد سے اختلاف کیا۔ جو وہاں کی سلطنت کا عین منشا تھا۔ اور کہا۔ کہ جب ہمیں اس سلطنت میں اس قدر امن حاصل ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہم اپنے ہاتھ سے انتظام کرنے کی تکلیف گوارا کریں۔ اسی اختلاف حالت میں عرصہ تک تو ہندوستان کا ملک اپنی ایک سطح پر رہا۔ لیکن اس ہٹ پرست قوم نے یہ دیکھ کر۔ کہ جب دوسری قوم ہماری ہمزبان نہیں ہوئی۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔ کہیں اس بات پر جھگڑا کیا۔ کہ اس نے گائے کیوں ذبح کی کہیں ان کے مکان کے سامنے سے [illegible] ان کے دروازے پر لگوادی۔ اس قوم کا اگر کوئی [illegible] یہ قوم چھیڑ کرتی رہی۔ یہانتک کہ دوسری قوم کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ وہ اپنی ایک جماعت الگ قائم کرے اور اپنے حقوق کا مطالبہ سلطنت [illegible] طرح کرے کہ یہ ناگوار [illegible] پیش نہ آئیں۔ ہم ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ اس مقصد میں کہانتک

کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ سوائے شکایت کے کہیں شکر کے الفاظ اس جماعت کے ریکارڈ میں نہیں پائے جاتے۔ اسی زمانہ میں سلطنت حکمران کا ایک ناظم اعلیٰ آیا جس نے ملک کے مشرقی حصہ کے دو ٹکڑے کر دیئے، اور اسطرح ملک کی مالگزاری بڑھا دی۔ اس کا اثر وہاں کی قوم پر ایسا خراب پڑا۔ کہ اس نے اپنی حرکات سے سلطنت کو یہ یقین دلا دیا کہ اگر کبھی ضرورت ہوگی۔ تو وہ اپنی ساری قوت اس کے خلاف استعمال کرنے میں دریغ نہ کرینگے۔ یہ وقت سلطنت کے لیے ذرا تشویشناک تہا۔ اس لیئے اس نے اس خیال سے کہ کہیں دوسری قوم بھی اس قوم سے نہ مل جائے، مغرب کے ایک بڑے دولت مند معزز رہنے والے کو جو دوسری قوم کا پیر اور سردار تہا۔ اپنی طرف کر لیا۔ اور اس کو یہ ہدایت کی۔ کہ جہاں تک ممکن ہو۔ وہ اپنے قوم کا خیال دوسری طرف بٹائے رکھے۔ اور مشرقی والوں سے نہ ملنے دے، اس معزز شخص نے جسپر اس کی قوم جان دیتی تہی۔ اسی وقت یہ ترکیب کی۔ کہ اپنی ساری قوم کی توجہ اس درسگاہ کیطرف مبذول کرادی۔ جو اس کے رہبر اولین کی قایم کی ہوئی تہی۔ اور کہا۔ کہ تم لوگ اگر ایک معقول رقم جمع کر لو۔ تو یہ درسگاہ بہت وسیع ہو کر سلطنت کی منظوری سے دارالعلوم بن سکتی ہے۔ یہ خیال ایسا دل خوش کن تہا۔ کہ قوم کا ہر متنفس اسی طرف متوجہ ہوگیا۔ اور چند دنوں میں وہ روپیہ جمع ہوگیا لیکن جب وہ رقم فراہم ہوگئی تو سلطنت نے اس طرح کا دارالعلوم بنانے سے انکار کر دیا جیسی اس قوم کے افراد کی خواہش تہی، سلطنت کا یہ فعل ایسا تہا جس کو بہت لوگوں نے محسوس کیا اور اُن کے دلوں میں ایک خفیہ برہمی پیدا ہوگئی۔ اتفاق وقت اس کے تھوڑے ہی دن بعد ایک دوسرے ملک میں جہاں کی رہنے والی سلطنت ہندو تہی۔ لڑائی چھڑ گئی اور ہندوستان کے اس دارالعلوم والی قوم کے ہم مذہب سلطنت کے ساتھ بہت زیادتی کی گئی ہر چند زیادتی کرنے والی قوم وہ نہ تہی۔ جو سلطنت ہند کی مالک تہی۔ مگر اس کی ہم مذہب ضرور تہی۔ اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہندوستان کی ایک قوم میں مذہبیت یا قومیت

کا احساس پیدا ہونے کا مواد پوری طرح فراہم ہو گیا۔ اور ملک کے چند افراد نے جو اسی قوم کے بعض پرجوش افراد کے ہاتھوں میں تھے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر اپنی قوم کو آخر کار اس بات پر راضی کر لیا۔ کہ اپنی جماعت کی غرض مشترک بھی وہ ہی قرار دیں جو دوسری قوم نے قرار دی ہے، اور سلطنت موجودہ سے وہ ہی یہی مطالبہ کریں، کہ "ملک کا انتظام ملک والوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے" لیکن جہاں یہ اخبارات اس بات پر زور دے رہے تھے، وہیں ایک جماعت ایسی بھی تھی۔ جو اس کی مخالف تھی۔ اور اس کا خیال تھا۔ کہ اس نوع کا انتظام ہماری قوم کے لیے کبھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ سلطنت موجودہ اس بات سے کبھی انکار نہ کرتی تھی۔ کہ وہ ملک کا انتظام ملک والوں کے سپرد نہ کرے گی۔ بلکہ وہ اس پر تیار تھی۔ بشرطیکہ اسے اس بات کا یقین دلا دیا جائے۔ کہ ملک والے اس قابل ہو گئے ہیں

جب دونوں قوموں کی خواہشیں اس معاملہ میں متحد ہو گئیں۔ تو ان کے بعض دانشمند لوگوں کو فطرتاً یہ آرزو پیدا ہوئی۔ کہ وہ آپس میں ہر طرح مل جائیں اور قوت متحدہ سے کام نکالیں لیکن اختلاف مذہب کی جو خلش دونوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی۔ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ کہ یوں آپس میں میل کر لیا جائے کیونکہ باوصف ان تمام دعاوی اتحاد کے اسی زمانہ میں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہو گئیں جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ تخالف ابھی باقی ہے، اور ایک دوسرے کے درپے آزار ہے۔

اسی زمانہ میں ہند کی سلطنت کو خود اپنے اصلی ملک میں ایک دوسری زبردست سلطنت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اس میں اس کو بہت زمانہ لگ گیا۔ ہندوستان کی دونوں قومیں اس وقت کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ کیونکہ ایسے نازک وقت میں سلطنت کو اپنی طرف متوجہ کرنا مناسب نہ تھا۔ مدت کے بعد جب جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور سلطنت ہند کو امن و اطمینان نصیب ہوا۔ تو اس امر کے اعتراف میں کہ جنگ کی حالت

یاں دونو قوموں نے کافی مدد دی۔ اور خاموش زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ان دونو کو الگ الگ اپنا دارالعلوم بنانے کی اجازت دیدی، اور انہیں شرائط کی ساتھہ جن شرائط کے ساتھہ وہ طلب کرتی تھیں۔ ہرچند سلطنت کے اس لطف وکرم کو ان قوموں نے نہایت شکرگذاری کے ساتھہ قبول کرلیا۔ لیکن اسی کے ساتھہ ان کی وہ خواہش جس میں وہ دونو مشترک تھیں۔ اور قوی ہوگئیں۔ اور چند سال کے بعد ہی علانیہ اس کا مطالبہ شروع کردیا گیا۔ اگرچہ سلطنت نے اس خیال کے تمام حامی اخبارات بند کرادیئے تھے۔ اور کوئی دقیقہ اس کے سدباب کے لیئے نہیں اٹھا رکھا گیا۔ لیکن یہ خیال اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔ اور ملک بھر کی ایک عام آواز یہی تھی کہ سلف گورنمنٹ ملنا چاہیئے (اب غالباً آپ لوگ کچھہ کچھہ سمجھنے لگے ہوں گے۔ کہ سلف گورنمنٹ کا کیا مفہوم ہے) اس شور وشغب کا فوری نتیجہ یہ ہوا، کہ مجالس انتظامیہ میں دونو قوموں کے سربرآوردہ حضرات کو بہ نسبت قبل کے ذرا زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی اجازت دیدی گئی۔ مگر اس رعایت سے وہ لوگ کچھہ خوش نہ تھے کیونکہ ان کو اب بھی یہی شکایت تھی۔ کہ ہماری کوئی نہیں سنتا۔ اور مجلس انتظامیہ میں چونکہ خاص سلطنت کے اراکین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اس لیئے کثرت رائے ہمیشہ انہیں کیطرف ہوتی ہے اور ملک والوں کو سوائے اس کے اور کچھہ نصیب نہیں ہوتا۔ کہ وہ دو دو گھنٹے تک کھڑے ہوکر چیخا کریں۔ اور بے کار اپنا گلا خشک کیا کریں (سناجاتا ہے کہ اس شکایت پر سلطنت کو ہنسی آگئی۔ اور شاید کچھہ رحم بھی آیا ہو۔ کیونکہ ان کو اجازت دیدی گئی۔ کہ وہ دوران تقریر میں جتنی دفعہ جی چاہے پانی یا چاء پی سکتے ہیں) کچھہ سال بعد سلطنت ہند کو بہ مشرق کی دوسری سلطنتوں سے برسر پیکار ہونا پڑا، اور اس میں ایسی کامیابی اس کو حاصل ہوئی کہ ہندوستان سے بہت زیادہ وسیع وزرخیز ممالک اس کے ہاتھہ آگئے۔ اور یہ کامیابی گو فاتح قوم کے لیئے باعث مسرت تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس کی جیسی سچی خوشی ہند کی

قوموں کو ہوئی۔ کسی اور کو نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس وسعت ملک گیری کا اثر یہ ہوا۔ کہ بوجہ قرب ہندوستان سوائے اس کے اور کوئی صورت نئے مفتوحہ ممالک پر اقتدار قائم رکھنے کی نظر نہیں آئی۔ کہ ہندوستان کو سلف گورنمنٹ دیدیجائے اور کچھ شرائط ایسے کر لیئے جائیں۔ جو سلطنت کے اقتدار کو بھی بدستور قائم رکھیں

چنانچہ ۱۹۴۵ء مطابق سنہ [illegible] جلالی وہ خاص سال تھا جس کی عرصہ سے تمنا کی جا رہی تھی۔ کیونکہ پہلا اعلان منجانب سلطنت اس مضمون کا شایع کیا گیا۔ کہ سال اخیر میں ملک والوں کو سلف گورنمنٹ چند شرائط مخصوصہ پر دیدی جائے گی۔ تمام صوبہ جات کے قایم مقام جمع ہوں۔ اور بعد رد و قدح اس کا فیصلہ کریں۔ کہ آیا وہ شرائط معلومہ پر سلف گورنمنٹ لینے کے لیئے تیار ہیں یا نہیں۔

اس اعلان نے ایک عجیب مسرت ملک میں پھیلا دی اور ہر طرف سے سلطنت کے پاس شکریہ کے تار آنے شروع ہو گئے۔ مگر اب وقت بیکار بیٹھنے کا نہ تھا۔ کیونکہ اصل کوشش کی گھڑی یہی تھی۔ اور وہ چال جو بہت عرصہ پہلے ہند کی اصلی قوم نے سوچ رکھی تھی۔ اب چلی جانے والی تھی۔

یہاں یہ ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ کہ جب ہند کی دوسری قوم بھی سلف گورنمنٹ کی خواہاں ہوئی۔ تو اس کے ارادوں میں استحکام اور اپنی آواز میں انکی معیت کی وجہ سے ایک قوت پیدا کرنے کیلیئے یہ بات سمجھا دی گئی کہ "ہر چند تمہاری آبادی نسبتاً بہت کم ہے۔ لیکن اس امر کی ضمانت کے لیئے کہ تمہارے حقوق کا مساویانہ انداز سے تصفیہ ہوگا ہم اس بات کا وعدہ کرتے ہیں۔ کہ سلف گورنمنٹ ملنے کی صورت میں تمہاری تین چوتھائی تعداد ہماری پوری تعداد کا مقابلہ کریگی۔ یا پھر ہماری تمہاری تعداد مجالس انتظامیہ میں برابر رہے گی اور صدر کا انتخاب بھی انہی اصول پر ہوگا۔" یہ ایک ایسا وعدہ تھا جس پر اعتماد کرنے کے بعد کوئی خلش دوسری قوم کو باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اب جبکہ صحیح وقت

کا کام آیا۔ اور سیلف گورنمنٹ کے ملنے کی آرزو پوری ہونے کے قریب آئی تو ایک خفیہ جلسہ اس قوم نے اپنا کیا۔ اور نہایت غور و فکر کے بعد دوسری قوم کے معزز افراد کو دعوت دی گئی۔ کہ وہ تمام امور پر غور کرنے کے لیئے جمع ہوں۔ یہ لوگ جمع ہوئے اور نہایت تپاک اور خاطر مدارات سے ہاتھوں ہاتھ لیئے گئے (اس دوسری قوم کے منجملہ دوسری خصوصیات کے یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ جہاں اس نے فوراً اظہار عجز کیا گیا۔ اور ضرورت سے زیادہ عزت کی گئی۔ بس پھر وہ بلا پس و پیش اپنے تئیں بلا حجت و خوشامد کے ہاتھوں میں سپرد کر دیتی ہے، اور اپنے بُرے بھلے کی تمیز نہیں کر سکتی) ایک ہفتہ تک یہ مجلس قایم رہی اور آخر کار اس احمق قوم کو یہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا۔ کہ "وہ وعدہ جو ہم نے متعلق لحاظ تعداد کیا ہے، ہر طرح مستحکم ہے۔ لیکن قبل سلف گورنمنٹ ملجانے کے اس کا اعلان سلطنت کے سامنے کرنا حاجز ہوگا۔ کیونکہ پھر اس صورت میں سلطنت کو دونو قوموں کے باہمی اتفاق کا پورا یقین آ جائے گا۔ اور کبھی اس یقین کی حالت میں سلف گورنمنٹ نہیں دیجا سکتی۔ کیونکہ فی الحال سلف گورنمنٹ کا دیا جانا۔ اسی یقین کی بنا پر ہے۔ کہ بوجہ کثرت و قلت (عدم توازن) دونو قومیں ضرور اختلاف کریں گی۔ اور پھر سلطنت کو ایک بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ اور وہ سلف گورنمنٹ نہ دے گی۔ اس لیے مصلحت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کی ہوا تک سلطنت کو نہ دیجائے، بلکہ اس کے سامنے یہی کہا جائے، کہ مجلس انتظامیہ کے ممبروں کا انتخاب دونو قوموں سے بلحاظ کثرت و قلت آبادی ہوگا، پھر بعد کو جب انتظام اپنے ہاتھ میں آجائے گا۔ تو اس کی ترمیم آسانی سے کر دی جائیگی اور وہ وعدہ جو پہلے کیا گیا ہے۔ بغیر کسی تغیر و تبدل کے پورا کیا جائے گا" کچھ تو خاطر مدارات کا اثر، اور کچھ یہ بات کہ یہ صلاح بھی بہت ٹھکانے کی ظاہر میں معلوم ہوتی تھی الغرض یہ لوگ راضی ہوگئے اور اپنی قوم کو بھی ان تمام مصالح کا ذکر کر کے اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ وہ اس معاملہ میں کسی قسم کی مخالفت کا اظہار نہ کرینگے۔ اور فی الحال جس طرح ہو،

سلف گورنمنٹ کو لینا ہی غنیمت جانیں گے۔ ۱۹۴۲ء آہستہ آہستہ گذرتا گیا۔ اور آخر کار، وہ دن آگیا جب کئی قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ ہونا تھا،

اس مجلس میں جو کچھ رد و قدح ہوا ہو۔ جو بحث مباحثہ ہوا ہو۔ اس کا ذکر فضول ہے۔ کیونکہ اصل چیز دیکھنے کی نتیجہ ہے اور اس کا اظہار انعقاد جلسہ کی شام کو ان الفاظ میں کر دیا گیا کہ

"ملک ہندوستان کو با بدولت ملک معظم سلف گورنمنٹ عطا فرماتے ہیں جو ایک سو ممبران پر مشتمل ہوگی۔ ان ممبران میں سے ایک ثلث ممبر اس قوم کے ہونگے۔ جو قوم حکمراں ہے اور باقی۔ تعداد کا انتخاب ہندوستان کی دو نو قوموں میں سے باعتبار نسبت آبادی ہوگا۔ لیکن اس کا پریسیڈنٹ (صدر) ہر حال میں حکمراں پارٹی کا ہوگا"

ہر چند اس امر کی بے انتہا کوشش کی گئی کہ حکمراں جماعت کا کوئی ممبر نہ ہو اور اگر ممبر ہو تو کم از کم صدر اس قوم کا نہ ہو۔ لیکن اس موقعہ پر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ممبران کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور بہت جلد یہ بھی طے ہو گیا۔ چونکہ ہندوستان کی قدیم رہنے والی قوم بہت زیادہ تعداد میں ہے، اس لیے قریب پچاس کے ممبر اس قوم سے منتخب ہوئے اور دوسری قوم سے صرف بیس۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تمام معاملات پر وہ قوم حاوی ہو گئی، اور چند دن میں اس نے ثابت کر دیا۔ کہ ان میں کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کی تائید میں ساری قوم کی قوم نہ اٹھ کھڑی ہو،

سلف گورنمنٹ ملنے کے پہلے ہی سال مجلس انتظامیہ میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ کہ چونکہ اصل زبان اس ملک کی وہ نہیں ہے جو یہاں رائج ہے، اس لیے ملک کا حق ہے۔ کہ اس زبان کو رواج دے جو اب مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ تمام کاغذات حکومت اور کارروائی عدالت اسی زبان میں ہو، (یہاں یہ امر ظاہر کر دینا مناسب ہوگا۔ کہ باعتبار زبان کے تو ملک میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ لیکن بہ حیثیت انداز تحریر کے ہندو یہ کہا جاتا

ہے۔ کہ اس قوم کا اصل حظ وہ نہیں تھا۔ جو دوسری قوم میں رائج تھا۔ اور اس قوم کی حکومت کے زمانہ میں رواج پا گیا تھا، یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ دوسری قوم کو اس سلف گورنمنٹ کی برکات کی طرف سے کچھ بے اعتقاد ہونے کی وجہ سمجھ میں آئی ہو، کیونکہ اس کو اس سے قبل یہ بالکل یقین تھا۔ کہ اُنکی طرف سے کوئی بات ایسی نہ اٹھائی جائے گی جو ان کے جذبات وحیات کے خلاف ہو۔ مگر اب سوچنے کا وقت نکل گیا تھا۔ اور حریف بازی لے گیا تھا۔ اس نے اس مسئلہ پر نہایت زور وشور سے تقریریں کیں۔ اور حکمران قوم کے بعض ممبروں نے بھی اس کی تائید کی کیونکہ ان کے نزدیک بھی اس حظ کا رواج دینا اسوجہ سے زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ اول تو اس کی تحریر میں ان کی زبان کی تحریر کی بھی کچھ شان پائی جاتی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ تحریر مروجہ میں باوصف مشق بسیار وہ کامیابی نہیں حاصل کر سکے تھے، الغرض یہ مسئلہ پیش ہوا۔ اور کثرت رائے کیوجہ سے پاس ہو گیا۔ اب مدارس میں یہ خط لازمی کر دیا گیا۔ اور نہایت عجلت کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی کتابیں اس زبان میں منتقل ہونے لگیں اس سال کے دوسرے جلسہ میں ملازمین کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ اور اس بات پر زور دیا گیا۔ کہ ہر محکمہ میں ملازمین کی تعداد وہی اسی حساب سے رکھی جائے، جس حساب سے ملحاظ آبادی انتخاب ممبران ہوا ہے، چونکہ دوسری قوم نے بروقت انتخاب ممبران اپنے سکوت سے اس معاملہ پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس سوقعہ پر ان کی چیخ پکار سنی جاتی۔ یہ مسئلہ بھی پیش کیا گیا۔ اور اس قوم کے جتنے زیادہ ملازم تھے۔ سب برطرف کئے جانے لگے۔ نیسرا قانون جس نے اور بھی رہی سہی عزت اس غریب قوم کی خاک میں ملادی یہ مسئلہ مقابلہ تھا۔ کہ کوئی وہ عہدہ جس میں انتظامی اختیارات عطا کئے جائیں نہیں دیا جا سکتا۔ تاوقتیکہ امتحان مقابلہ میں کامیابی حاصل نہ کی جائے چونکہ یہ قوم تعلیم میں اس قوم سے بہت پیچھے تھی۔ اور باوصف جدوجہد وہ ایک صدی کی کمی کو چند سالوں میں پورا نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس تعداد میں بھی کمی ہو گئی جو از روئے آبادی ہونا چاہیئے تھی۔ یہ چند باتیں

ایسی پے در پے ہوئیں۔ کہ جن سے دوسری قوم نے علی الاعلان اس بات کو محسوس کرلیا۔ کہ ہمیں سخت دہوکا دیا گیا۔ اور وہ قوم کبھی ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہانتک تو صرف انتظامی معاملات تھے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر کیسی حیرت ہوئی۔ کہ اس سال جو میں وہاں گیا۔ تو بعض شاندار جانوروں کی ایسی کثرت تھی۔ کہ انکی وجہ سے بازار کا چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے اسوقت بھی اس ملک کی سیاحت کی تھی۔ جب سلف گورنمنٹ کا بھوت ملک پر سوار نہ تھا۔ لیکن اسوقت یہ عجیب وغریب بات دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اسکی وجہ یہ معلوم ہوئی۔ کہ ان جانوروں کا ذبح ہونا بند ہو گیا ہے۔ کیونکہ ان کے مارے جانے سے اس قوم کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ان کے ذبح نہ کرنے سے دوسری قوم کے مذہبی احساسات کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر یہ کثرت رائے کی بلا ایسی ہی طرح مسلط تھی کہ دوسری قوم کسی معاملہ میں پھر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی الغرض اس سلف گورنمنٹ نے ہندوستان کی ایک قوم کو بنا دیا اور دوسری قوم کو بالکل تباہ کر دیا۔ نہ عمدہ ملازمتیں انکے پاس ہیں اور نہ تجارت ان کے ہاتھ میں ہے۔ ملک کیطرف سے جو سرکاری مدارس مختلف علوم وفنون کے جاری کئے گئے ہیں ان میں بھی قلت وکثرت آبادی کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ہر قوم کے اسیقدر طلبا داخل کئے جاتے ہیں۔ جتنے ازروے حساب ہونے چاہئیں

جب چند سال اسی طرح گذر گئے اور کوئی تدبیر اس سے چھوٹنے کی نظر نہ آئی۔ تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ کہ ہر حال میں غالب قوم کا ساتھ دیا جائے چنانچہ دوسری قوم کے اکثر ممبروں نے یہ وتیرہ اختیار کرلیا۔ کہ ہر بات میں اپنے مخالفوں کا ساتھ دیں۔ اور انہیں کے خیالات کے ساتھ ساتھ اپنے اغراض ومقاصد کو وابستہ کردیں۔ ہرچند یہ انکی خود غرضی تھی۔ ان کا ضمیر ضرور انہیں ملامت کرتا تھا۔ لیکن انہوں نے اس خیال سے کہ جب مخالفت کرنے سے قوم کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ تو ان کا ساتھ دے کے کیوں نہ ذاتی اغراض میں کامیابی حاصل کیجائے۔ لیکن زمانہ نے انہیں یہ

بات بہت جلد ثابت کر دی۔ کہ قوم کی قوم سے نفرت کرنے والا اس قوم کے بعض افراد
پر بھی کبھی لطف نہیں کر سکتا۔ انہوں نے خوشامدیں کیں، لجاجت و منت سے کام لیا
لیکن اس قوم نے جو بہت زیادہ زیرک تھی۔ ان کو ٹھکرا دیا۔ اور کہدیا۔ کہ کیا تم اپنے
ہی ہاں کا وہ مقولہ بھول گئے کہ "دنیا مکر ہے اور بغیر مکر کے حاصل نہیں ہو سکتی" ہم نے
مکر کیا۔ اور اس مکر کے ذریعہ سے تم کو مغلوب کر لیا۔ لیکن یہ یاد رکھو۔ کہ ہم تمہارے مکر
میں کبھی نہ آئیں گے۔ اور اس دنیا کو کبھی تمہارے پاس نہیں جانے دینگے جس کو ہم نے
اتنی تمناؤں۔ اتنی آرزوؤں، اور اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ اور پھر ہماری
سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تمہیں کیا حق حاصل ہے۔ کہ ہمارے ملک میں کسی ترقی کی آرزو
رکھو۔ ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ تم نکل جاؤ (ہر چند ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں) رہو، لیکن اسی طرح
رہو جس طرح ایک اجنبی، اک غیر رہتا ہے، اپنی تمناؤں کو مختصر کرو۔ اپنی آرزوؤں کو محدود بناؤ
اپنے حوصلوں کی بلندی کو پست کرو۔ اور رہو جسطرح ہم تمہیں رکھنا چاہیں۔ ہم کو تمہاری خون آشام
داستانیں یاد ہیں ہم کو معلوم ہے کہ تم نے کس طرح ہمارے یہاں کے مقدس بتوں کو برباد کیا ہم جانتے ہیں۔ کہ تم
لفظ "ہندو" کے معنی غلام کیا کرتے ہو، ہم اس سے بیخبر نہیں ہیں کہ تمہارے بزرگوں نے ہمارے مذہب کے استیصال میں کوئی دقیقہ نہیں
اٹھا رکھا۔ پھر کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ وہ قوم جو تم سے اتنا دیرینہ بغض
رکھتی ہو، تمہارے ہاتھوں سے اس قدر تکلیفیں پہنچی ہوں۔ کبھی اس بات پر راضی ہو سکتی
ہے کہ تمکو وہ رعایتیں دے جسکے تم کبھی مستحق نہیں تھے، تمہارے ساتھ وہ سلوک کرے
جو تم نے کبھی اس کے ساتھ نہیں کئے۔ ہم ہنستے تھے، جب اک زمانہ میں تمہارے بعض
لیڈر ہمارے ساتھ رفق و اتحاد کا درس دیتے تھے (ہم بھی ہاں میں ہاں ملاتے تھے صرف
اس لیئے کہ ہمیں تمہاری اس بیوقوفی سے بڑا کام نکالنا تھا۔ ہم کو تمہارے ہی ہاتھ سے
ہلاک کرنا تھا) حالانکہ ان کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ شرق و غرب اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ شمال جنوب سے
مل سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ کہ اسلام اور ہندویت ایک جگہ جمع ہو سکیں،

دوسرا صفحہ

یہ روزنامہ یا میری داستان سیاحت ہرگز مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ اگر میں ہندوستان کی تعلیمی حالت پر روشنی نہ ڈالوں ہر چند مجھے اپنے برادران ملک کے سمجھانے میں بہت دقت ہوگی۔ اور میں حیران ہوں۔ کہ کن الفاظ میں ان مشاہدات و تجربات کا ذکر کروں، کہ میرے احباب حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں۔ لیکن ہر حال میرے لیے یہ ذکر ناگزیر ہے۔ اور بلا لحاظ اس کے کہ میں کس حد تک ادائے مطالب میں کامیاب ہوں گا۔ اس عجیب و غریب داستان کو شروع کرتا ہوں۔ میں پہلے یہ عرض کر چکا ہوں۔ کہ ہندوستان میں دو قومیں مختلف الخیال اور مختلف المذہب رہتی ہیں۔ اور ان دونو قوموں کے جذبات و داعیات و خواہشات و آمال ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں۔ کہ اگر میں کسیکو سمجھانے کی غرض سے ان کو سیاہ و سپید شیرینی و تلخی، نشیب و فراز ہاں نہیں سے تعبیر کروں تو غلطی نہ کروں گا۔ میں اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ ان دونو قوموں پر حکومت کرنے والی ایک تیسری قوم ہے۔ جو نہ ان کے مذاق کی ہے نہ ان کے ملک کی ہے۔ اور جس کے خصائص و امیال ان دونو سے علیحدہ ہیں۔ غالباً ملک مریخ کے رہنے والوں کے لیے یہ عجیب و غریب خبر ہوگی۔ کہ کسی ملک پر حکومت کرنے والا اسی ملک کا نہ ہو، بلکہ کسی دوسرے ملک سے متعلق ہو۔ لیکن وہ یقین کریں۔ کہ ہندوستان کا یہی حال ہے۔ اور شاید خدا کا یہ انتظام مناسب ہے ورنہ ایسے ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو جانے میں پہلے برادران ملک پر یہ ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ وہاں بہت جد و جہد کے بعد سلف گورنمنٹ قائم ہو گئی ہے، اور میں اس سلف گورنمنٹ کی پوری تعریف اور اس کے نتائج کو بھی بتلا چکا ہوں۔ کہ ایک قوم جس کو ہندوستان کی قدیم قوم ہونے کا فخر حاصل ہے بہت ترقی کر گئی ہے۔ اور دوسری قوم یہاں کسی زمانہ بعید میں فاتح کی حیثیت سے آئی تھی، سخت انحطاط کی حالت میں ہے۔ یہانتک کہ اس کی قدیمی روایات بھی بالکل

مٹ گئی ہیں۔ اور وہ ایک ایسے ادنیٰ طبقہ میں شمار کی جاتی ہے۔ جس کے احساسات کی رعایت قانون ملکی میں ضروری خیال نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ ایک تو میں مسئلہ سلف گورنمنٹ کے بیان میں ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ قبل سلف گورنمنٹ کی خواہش کرنے کے اس قوم نے یہ نہیں دیکھا۔ کہ دوسری قوم جس کو اس سے ہمیشہ سے بغض وعناد چلا آتا ہے، اپنی کثرت آبادی کے لحاظ سے کسقدر غالب آجائے گی۔ اور پھر وہ کسی ایسے ایثار کی قدر نہ کرے گی جو وقت پر سخت فریب دے کر حاصل کیا گیا تھا۔ اور دوسری وجہ اس قوم کا نظام تعلیم تھا۔ میں لفظ نظام سے تعبیر کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس میں کبھی کوئی نظام قائم نہ ہوا تھا۔ اور تماشہ یہ ہے کہ اس قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے ہمیشہ اس کو نظام ہی کہہ کہہ کر قوم کو دھوکا دیا۔ اور آخر کار اسے کہیں کا نہ رکھا۔ اس کو سمجھانے کے لیے یہی مجھے تاریخ کے بہت سے اوراق لوٹنے پڑیں گے، ورنہ میرا ملک ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ کبھی تعلیم بھی کسی قوم کو تباہ کر سکتی ہے۔ مگر سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے۔ کہ ہندوستان میں تعلیم کے معنی صرف سکھانے اور بتلانے کے ہیں۔ اور جیسا کہ ہمارے ملک میں سکھانا اور کسی کی حالت میں انقلاب صحیح پیدا کر دینا دو مترادف الفاظ ہیں۔ وہاں یہ نہیں ہے بلکہ وہاں یہ دونوں چیزیں نہ صرف مختلف بلکہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اور شاید اس معلوم کر لینے کے بعد اصل بحث سمجھنے میں زیادہ مدد ملے گی جس وقت تک یہ تیسری قوم یہاں آکر حکمراں نہ ہوئی تھی اسوقت تک اسی قوم کی ہندوستان میں حکومت تھی۔ اور ان میں علوم کا چرچا تھا۔ جو یہ اپنے ساتھ شمال سے لائی تھی۔ اسوقت تک زمانہ ترقی کرتا تھا یا نہیں۔ یہ دوسری بحث ہے، لیکن یہ یقینی ہے۔ کہ ہندوستان کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔ کہ یہاں سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ یا کبھی تیسری قوم ان پر حکومت کرنے باہر سے آئیگی۔ اس حکومت کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت ایک نوع کی مذہبی حکومت تھی۔ اس میں تعلیم صرف اسی حد تک رہتی تھی جس حد تک مذہب

میں رسوخ اور مذہبیت میں استحکام قایم رکھنے کے لیئے ضروری ہو۔ اور اس میں کلام نہیں کہ کہ اس پہلو سے ان کی حکومت ایک مکمل حکومت تھی جس میں تنزل ممکن نہ تھا، اگر وہی اصول قایم رہتے، اور ہندوستان کی آب و ہوا کی وہ خصوصیات جو ہمیشہ قوموں کے زوال و انحطاط میں معاون ہوئی ہیں، اس حکومت پر موثر نہ ہوتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ مذہبیت کم ہوتی گئی۔ وہ سادگی وہ عملی زندگی، اور وہ مستعدی جو اس قوم کا شعار تھی نابود ہوتی گئی۔ یہانتک کہ انکی حکومت بہت ضعیف ہوگئی۔ اور ان کا اقتدار بالکل مضمحل۔ یہ ایسا وقت تھا۔ کہ اگر ہندوستان کی اصلی قوم میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی۔ تو وہ اپنی گمشدہ عزت کو واپس لے لیتی۔ مگر پہلے کی خانہ جنگیوں اور باہمی اختلاف نے اس کو اس قدر ضعیف نہ کر دیا تھا۔ کہ وہ پھر اسقدر جلد سنبھل جاتی۔ بہرحال وہ اس ضعف سے فائدہ نہ اٹھا سکی، بلکہ خدا نے ایک تیسری قوم کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیئے بھیجدیا۔ اور یہیں سے اصل بحث شروع ہوتی ہے،

اس تیسری قوم کی حکومت کس طرح رفتہ رفتہ بڑھی اور اس کا اقتدار کس تدریج کے ساتھ سارے ملک پر قایم ہوگیا۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ اور اس کا خلاصہ کسی دوسری جگہ آپ دیکھیں گے، یہاں صرف یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اس قوم کی حکومت بجائے تلوار کے زیادہ تر فراست و دانائی سے قایم ہوئی جس کو پالیسی یا حکمت عملی کہتے ہیں۔ اور اس لیئے ظاہر ہے کہ اس کو یہاں کی قوموں پر حکومت قایم کرنے کے لیئے فوری انقلاب کے اصول کو نظر انداز کر دینا پڑا ہوگا۔ جس وقت یہ قوم برسر اقتدار ہوئی۔ تو سب سے پہلی چیز جس پر اس کی نگاہ پڑی ہندوستان کی مختلف المذاق آبادی تھی اس نے خیال کیا۔ کہ ایسے ملک پر حکومت کرنا گو ابتداً دشوار نظر آئے۔ لیکن اصولاً نہایت آسان ہے۔ اور اس لیئے اس نے فوراً انہی اصول کے مطابق بنیاد سلطنت ڈالنے کی ابتدا شروع کر دی۔ اس قوم کی زبان بالکل مختلف تھی۔ اور ہندوستان کی مروجہ زبانوں سے وہ باعتبار ہجا و نحو باعتبار ترکیب الفاظ وغیرہ

متبائن تھی۔ اور اس لیئے ظاہر ہے کہ یہاں کی معاشرت یہاں کی حالت اور یہاں کے تمام طبقات و اقوام کی کیفیت معلوم کرنے کے لیئے اس کو بہت دشواریوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہوگا، بالکل ممکن تھا۔ کہ وہ دفعتہً اپنی زبان کو رائج کرنے کی کوشش شروع کرتی اور یہائی قوموں کو مجبور کرتی کہ وہ اسے حاصل کریں۔ لیکن اس نے ایسا کرنا مناسب نہیں بلکہ اس کے خلاف خود یہیں کی مروجہ زبان کو ترقی دینی شروع کی۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا۔ کہ وہ وحشت و مغائرت جو یہاں کے لوگوں کو قدرتاً ہونی چاہیئے تھی، رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوا۔ کہ خود اس برسر اقتدار قوم کے افراد حکومت کو ہندوستان کی قوموں کا مطالعہ کرنے کا زیادہ موقعہ حاصل ہونے لگا۔ اور اس طرح اس پالیسی کے کارگر ہونے کے لیئے زیادہ سہولتیں پیدا ہونے لگیں جس کی بنیاد صرف تالیف قلوب کے یقین دلانے پر قایم کی گئی تھی،

اسی دوران میں جب یہاں کی قوموں کو معلوم ہوا۔ کہ یہ نئی حکمراں قوم ہماری حالت درست کرنے پر آمادہ ہے، اور ہم پر حکومت بجائے قوت کے محبت سے کرنا چاہتی ہے تو ان کو از خود اس کی طرف سے خیال محبت و ہمدردی قایم ہونے لگا۔ اور اسطرح وہ مغائرت جو زبان کیطرف سے تھی کم ہونے لگی۔ اور ان کو بھی مغرب کی زبان سیکھنے کیطرف سے جو مخالفت تھی۔ میلان میں تبدیل ہونے لگی، اس میں کلام نہیں۔ کہ یہ مغربی حکمران قوم شروع ہی سے اس بات کی خواہشمند تھی۔ کہ محکوم قومیں ہماری زبان سیکھیں، اور یہ خواہش اس کی بالکل فطری تھی۔ کیونکہ اس کو ضرورت تھی یہیں کے آدمیوں سے کام لینے کی اور جب تک وہ حکمراں زبان میں کام کرنے کے قابل نہ ہوتے بڑے بڑے افراد حکومت کو معاملات نظم و نسق میں آزادی کے ساتھ کام کرنے اور کام لینے کا موقعہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ رہا یہ امر کہ خود اس قوم نے کیوں نہ یہاں کی زبان میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ سو اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ حیثیت حکمراں

ہونے کے اس کو یہ حق حاصل تھا۔ کہ قوم کسی بات پر مجبور ہونے کی جگہ وہ دوسرے کو مجبور کرے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ اس نے کبھی مجبور نہیں کیا بلکہ رفتہ رفتہ انتظام کی بنیاد ایسی ڈالدی، کہ لوگوں کو خود مجبوراً مغربی زبان سیکھنی پڑی، اور اس کا مدعا بغیر کسی جبر و تعدی کے حاصل ہوگیا،

جب ہندوستان کی دونوں قوموں کو معلوم ہوگیا۔ کہ ان کی دنیاوی ترقی کا انحصار زیادہ تر مغربی زبان سیکھنے پر ہے تو ان میں تحریک پیدا ہوئی۔ لیکن یہ تحریک ہی دونو قوموں میں ایک ہی ساتھ پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ ان دونو میں بہت تفاوت رہا تھا۔ ہندو قوم جو اس سے قبل ہی محکوم رہ چکی تھی اور جس کے قوائے حکومت بہت زیادہ مضمحل یا فنا ہو چکے تھے اس نے سب سے پہلے اسطرف توجہ کی اور دوسری قوم نے جس کو مسلمان کہتے ہیں اور جس کی حکومت کو زائل ہوئے ابھی بہت تھوڑا زمانہ ہوا تھا۔ بہت دیر میں توجہ کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے، کہ ہندوؤں کی خود ابھی کوئی خاص زبان تھی ہی نہیں۔ جو زبان ان میں رائج تھی وہ مسلمانوں ہی کی تھی۔ اس لیئے کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ وہ غیر زبانوں میں سے اس زبان کیطرف نہ متوجہ ہوتے۔ جو فی الحال حکمراں تھی اور جس کے حاصل کرنے سے فوائد کے حصول کی بھی توقع تھی ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت عرصہ ہوا فنا ہو چکی تھی۔ اور معاشرتی زبان خود دوسروں سے وام لی گئی تھی۔ اس لیئے ان کو مغربی زبان کے حصول میں ذرا پس و پیش نہ ہوا اور سب سے پہلے وہ لبیک کہتے ہوئے اس کیطرف بڑھے، برخلاف مسلمانوں کے کہ ہنوز ان میں اپنی حکومت کی یاد باقی تھی اور وہ اس کو عار جانتے تھے۔ کہ اس قدر جلد دوسری قوم کی زبان کے سامنے سر عجز خم کردیں علاوہ اس کے خود انکی مذہبی زبان زندہ تھی۔ اور چونکہ مذہب اور حکومت ان کے ہاں دونو توام چیزیں ہیں۔ اس لیئے

اپنے ہاں کے طریقہ تعلیم کو چھوڑ کر مغربی یا کسی دوسری زبان کے نصاب کو اختیار کرنے میں نہ صرف بہ لحاظ ظاہری وجاہت کے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ بلکہ بہ اعتبار مذہب کے بھی وہ اسے کچھ اچھا نہ سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ اکثر افراد کا تو یہ خیال تھا۔ کہ مغربی زبان چونکہ کفار کی زبان ہے اس لیئے اس کے حاصل کرنے میں زوال مذہب کا اندیشہ ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کہ یہ خیال صحیح تھا یا غلط کیونکہ آئندہ واقعات نے اس کا بہترین فیصلہ کر کے دکھا دیا لیکن اس میں کلام نہیں۔ کہ اس خیال نے عرصہ دراز تک ان کو مغربی زبان کیطرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اور اسطرف ہندو قوم ترقی کرتی گئی، اس کا نتیجہ وہی ہوا جو کچھ ہونا چاہیئے تھا یعنی ہندوؤں کا درخور ارباب حکومت کی طبیعتوں میں زیادہ ہو گیا۔ اچھی اچھی نوکریاں ان کو مل گئیں۔ اور مسلمان اس مسئلہ میں بہت پیچھے رہ گئے، اس طرف جب مغربی قوم نے یہ دیکھا کہ ہندو نئی قوم قابو میں آگئی ہے۔ تو انہوں نے اس باب میں سختی کرنی شروع کی، کیونکہ نصف فتح ان کے مقصد کی ہو چکی تھی۔ اور اب وہ جان گئے تھے۔ کہ مسلمانوں کو بھی طوعاً یا کرہاً اخیر میں وہی اختیار کرنا پڑے گا جس کو ہندوؤں نے پہلے ہی سے اختیار کر لیا ہے،

اسی حال میں ایک زمانہ گذر گیا اور مسلمان بدستور اس زبان سے متنفر رہے لیکن چونکہ خدا کو مسلمانوں کی قوم میں ابھی ایک اور انقلاب پیدا کرنا تھا۔ اس لیئے دفعۃً ان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے ساری قوم کے یقین واعتقاد کے خلاف وعظ شروع کیا، اور مغربی زبان کی تحصیل کو ذریعہ فلاح ونجات قرار دے کر اس کی عملی کوششیں شروع کر دیں، ہرچند اس پر مسلمانوں میں اول اول بہت برہمی پھیلی اور اس شخص کو خارج از مذہب قرار دیا گیا۔ لیکن چونکہ زمانہ اس شخص کا مساعد تھا، اس لیئے آہستہ آہستہ اس کے مواعظ کا اثر شروع ہوا۔ اور خاص خاص لوگوں کو اسطرف توجہ ہونے لگی اس نے دارالعلوم کے نام سے ایک مکتب جاری کیا۔ اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے

بچے اسیں آآکر داخل ہونے لگے ، ہر چند یہ ایک فال نیک تھی ، اور خیال کیا جاتا تھا۔ کہ مسلمانوں کی پستی و ذلت شاید اس طرح دور ہو سکے گی۔ لیکن مستقبل نے ثابت کر دیا۔ کہ یہ خیال خام تھا اور ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی ،

ہم نہیں کہہ سکتے ۔ کہ اس بانی دار العلوم کا مدعا تعلیم سے کیا تھا۔ آیا وہ علم کو علم کی غرض سے رائج کرنا چاہتا تھا۔ یا صرف اس لیئے کہ جو مغائرت مابین حکمران جماعت و محکوم قوم پائی جاتی ہے وہ رفع ہو جائے اور مسلمانوں کو بھی معزز نوکریاں ملنے لگیں لیکن اس میں کلام نہیں ۔ کہ اس شخص کے مر جانے کے بعد جن ہاتھوں میں دار العلوم کا انتظام منتقل ہوا ، وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ تھے جنکا مقصود کبھی مسلمانوں کی ترقی نہ تھی ۔ بلکہ اس سے مقصود صرف اپنے لیئے کسب جاہ و حصول عزت کی کوشش تھی اور اس کا ثبوت صرف واقعات سے ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ اُنہوں نے جو کچھ کیا اس سے مسلمان بچوں کو بجائے فائدہ پہنچنے کے سخت نقصان ہوا۔ اور وہ غریب کسی طرف کے نہ رہے ، ہر چند یہ کہنا ۔ کہ مسلمانوں کو اس تعلیم سے حکومت کے ساتھہ وابستگی پیدا نہیں ہوئی ۔ یا ان کو چند مقتدر معزز نوکریاں نہیں ملیں ۔ حقیقت سے انکار کرنا ہوگا لیکن اس کا کیا علاج ۔ کہ اس نصب العین نے حقیقی مفہوم تعلیم کا پس پشت ڈالدیا ۔ اور انکی اخلاقی حالت اور زیادہ خراب ہوتی گئی ۔ سب سے پہلے جو غلطی ہندوستان کی قوموں نے کی ، وہ یہ تھی ۔ کہ اُنہوں نے اس راز کو نہیں سمجھا ۔ کہ کیوں حکومت اپنی زبان کو ملک میں رائج کرنا چاہتی ہے ۔ اور اگر اس راز کو وہ سمجھیں بھی تو ایک طویل زمانہ گذر جانے کے بعد جب خرابیاں حد سے متجاوز ہو گئیں اور علاج دشوار سے دشوار تر ہو گیا ،

یہ امر سب کو بخوبی معلوم تھا ۔ کہ یہ مغربی قوم بڑی عملی (پریکٹیکل) قوم ہے ، اور اس کے ہاں ایسے علوم و فنون کثرت سے ہیں جو ایک قوم کو بہت جلد سطح ترقی پر لا سکتے ہیں لیکن کسقدر افسوس ہے کہ باوصف اس علم کے ہندوستان کی قوموں اور علی الخصوص

مسلمانوں کی قوم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا۔ کہ صرف زبان سیکھ لینے سے کسی زبان کے علوم و فنون حاصل نہیں ہو سکتے، اور جبتک علوم و فنون پر قابو نہ حاصل ہو، اس وقت تک حقیقی ترقی معلوم، یہ کہنا کہاں حقیقت ہوگا۔ کہ اس حکمراں قوم نے ان علوم و فنون کے سیکھنے کی ممانعت کر دی تھی، لیکن اس کے ساتھ اسمیں بھی کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس نے اسطرف زیادہ توجہ بھی نہیں کی۔ اور وہ شاید زیادہ قابل ملامت بھی نہیں کیونکہ اسے کوئی ضرورت نہ تھی۔ کہ اپنے اوقات اپنی دولت کو یہاں کی قوموں کے اوپر صرف کرتی۔ علی الخصوص اسوقت جبکہ ان میں باہم اسقدر تفاوت صورت و سیرۃ ہو۔ بہرحال پہلی غلطی تو یہی تھی۔ اور دوسری غلطی جس نے فوری اثر کیا یہ تھی۔ کہ ہندوستان کی قوموں نے اپنی ملکی معاشرت و تمدن کو یکسر فراموش کر دیا، اور یہ یقین کیا۔ کہ شاید حکمراں قوم کی معاشرت ان کے لیئے زیادہ مفید و بہتر ثابت ہوگی۔ بہرحیف۔ یہ سوال تمدن و معاشرت کے متعلق ہے اور مجھے جداگانہ اس سے بحث کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق تعلیم سے ہی ہے اس لیئے میں یہیں بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ یہ زہر اسی زبان کی تعلیم سے پھیلا۔ اور رفتہ رفتہ عام ہو گیا، اگر قومی مدارس میں یہ نکتہ فراموش نہ کیا جاتا۔ کہ زبان و معاشرت دو الگ الگ چیزیں ہیں تو شاید یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اسقدر جلد انحطاط شروع نہ ہوتا۔ لیکن کیسا غضب ہوا کہ زبان سے پہلے معاشرت پر توجہ کی گئی اور خاص و عام ہر شخص نے اس کو بہتر سمجھا، اگر دارالعلوم مسلمانوں نے قایم کیا تھا۔ اور دیگر علوم و فنون کیطرف جو واقعی ذریعہ فوز و فلاح ہیں۔ توجہ نہ تھی۔ بلکہ صرف زبان کا حاصل کرنا۔ اور اسی طرح نوکریاں کر کرکے پیٹ پال لینا مقصود تھا، تو یہی خیر ضمنیت تھا۔ لیکن یہ کیسا قہر ہوا۔ کہ اس کے ساتھ انہوں نے اپنی معاشرت کو، اپنے مذاق کو، اپنی زندگی کو اپنے اصول تمدن کو بھی بدل دیا۔ اور اس قوم کی معاشرت و تمدن کو اختیار کرنا شروع کیا جو اپنی دولت و تمدن کے لحاظ سے اسکی

اہل تھی۔ اور زندگی کے فضول مصارف کو بھی برداشت کر سکتی تھی۔ الغرض مسلمانوں نے یہ بہت بڑی غلطی کی اور اس غلطی کی ذمہ دار قوم نہیں ہے۔ بلکہ قوم کے وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں مصلحین کہتے تھے۔ اور ایسا کہلایا جانا پسند کرتے تھے،

غالباً ملک مریخ کے رہنے والے یہ بات معلوم کر کے ہنسیں گے۔ کہ ہندوستان میں حال و قال علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور نہ صرف علیحدہ علیحدہ بلکہ بالکل ایک دوسرے کی ضد ہمارے ملک کی تو یہ کیفیت ہے کہ جبتک خود کسی شخص میں کوئی کیفیت نہ ہو۔ اس وقت تک اس کا اظہار الفاظ سے ممکن ہی نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرنا چاہے، تو لبوں سے حرکت اور زبان سے قوت گویائی منقطع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان کا یہ میرا عجیب و غریب تجربہ ہے کہ وہاں دل اور زبان دو الگ الگ خود سر قوتیں ہیں بہت کم بلکہ شاذ ایسا ہوتا ہے کہ زبان پر دل کی حکومت ہو۔ ورنہ اکثر صورتوں میں یہی دیکھا جاتا ہے۔ کہ زبان ہمیشہ دل کے خلاف کہتی ہے، اور اسقدر خلاف کہ میں نے تو یہ اصول قرار دے لیا تھا۔ کہ جب کسی شخص کی زبان سے ہاں نکلتا تھا۔ تو میں یہ سمجھتا تھا۔ کہ ضرور اس کے دل میں نہیں ہے، اور جب زبان کسی بات کا انکار کرتی تھی۔ میں یقیں کر لیتا تھا کہ اس کا دل ضرور اقرار کرتا ہے، اس اختلاف زبان کی جس کو میں اپنے ملک کے آئین کے لحاظ سے اجتماع ضدین کہوں گا۔ اس قدر کثرت تھی کہ امیر سے لے کر غریب تک اور مذہبی آدمی سے لے کر بچے دنیا دار تک سب اسی مرض میں مبتلا تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر شخص ایک دوسرے کا مخالف اور ہر گروہ دوسرے کا دشمن بن گیا۔ اور ساری قوم کی قوم کا شیرازہ جو پہلے ہی سے منتشر تھا، بالکل برباد و تباہ ہو گیا۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ جھوٹ بولنا ان کے ہاں مذہباً داخل معصیت ہے، لیکن وہ اپنی اس حالت کو کذب و دروغ میں شامل نہیں کرتے۔ تاہم میری سمجھ میں آجتک باوجود غور و فکر کے بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس سے علیحدہ کذب و دروغ کیونکر دنیا میں پایا جا سکتا

ہے۔ بہرحال ہندوستان کے لوگ علی الخصوص مسلمان اس کے عادی ہیں اور اس کو اپنی فراست و دانائی پر محمول کرتے ہیں،

اس اختلاف حال و قال سے ان کے مدارس بھی خالی نہ تھے۔ چنانچہ جب میں مسلمانوں کا دارالعلوم دیکھنے گیا۔ تو مجھے یہ معلوم کرکے کسقدر حیرت ہوئی کہ وہاں کوئی درس ایسا نہیں دیا جاتا جس کے خلاف خود ان مدرسین کا طرز عمل نہ ہو۔ مثلاً وہاں ایک شعبہ تعلیم اقتصادیات سے بھی متعلق تھا۔ لیکن میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی ایک مثال تو ایسی مل جائے جس کے حال کو بھی اس کے درس کے مطابق دیکھوں۔ لیکن کامیاب نہ ہوا،

مجھے ایک دن کیسا تعجب ہوا۔ جبکہ ایک پروفیسر لڑکوں کو بتا رہا تھا۔ کہ بلاضرورت کسی چیز کو لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ ضرورت کی چیزیں بھی کسی وقت علیحدہ کرنی پڑیں گی اور حال یہ تھا۔ کہ خود اس پروفیسر کا وجود سر کی ٹوپی سے لے کر پاؤں کی جوتی تک اور لکچر روم (دارالخطابت) چھت کے کاغذ سے لے کر زمین کے فرش تک غیرضروری چیزوں اور سامان آرایش سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسی طرح وہاں ایثار و ہمدردی صلۂ رحم وغیرہ کے بہت سے مواعظ ہوتے تھے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا تھا۔ کہ یہ الفاظ یہاں صرف زبانی یاد کرلیے گئے ہیں، اور ان کا مفہوم کوئی نہیں ہے،

اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں کی قوم تجویزوں کے سوچنے میں ملکہ تامہ رکھتی ہے اور شاید دنیا میں کوئی قوم اس مسئلہ میں ان سے بازی نہیں لے جاسکتی لیکن جس طرح ان تجویزوں کی سٹی ان کے ہال پلید ہوتی ہے، اس کی نظیر بھی کہیں نہیں مل سکتی، مجالس قایم کرنا۔ محافل شوریٰ برپا کرنا دل کش و خوشنما تجاویز کے اعلان سے سارے ملک میں ایک گونج پیدا کردینا اس قوم کے مصلحین کا معمولی کام تھا۔ لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ کرتے کیا تھے اس تمام شور و شغب سے فائدہ کیا تھا۔ تو

تو یہاں بس صرف ہوتا تہا مسلمانوں کی قوم عجیب وغریب قوم تہی۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ اگر کوئی ان سے کام لینا جانتا۔ تو وہ سب کچھہ کر سکتی تہی۔ لیکن افسوس ہے کہ کسی کام کو کام کی طرح کام کرنے کا سلیقہ پیدا نہ ہوا۔ اور تمام دولت جو قوم سے لغو وبے سروپا مواعید پر حاصل کی جاتی تہی ہمیشہ چند نفوس کی ذاتی اغراض پر صرف ہوا کی غربا کو تو خیر کون پوچہتا۔ خود امرا کا طبقہ بہی اس نظام تعلیم سے کچھہ زیادہ مستفید نہ ہوا۔ اور اخلاقی لحاظ سے تو اور زیادہ تباہ وبرباد ہوگیا

جب حالت یہانتک پہنچگئی۔ اور فریب کاریاں حد سے بڑہ گئیں۔ تو قوم کے بعض افراد کو اسطرف توجہ ہوئی اور ان کے طرز عمل پر نکتہ چینیاں شروع ہوئیں، لیکن اب وقت گذر گیا تہا۔ اور مرض حد سے بڑہ گیا تہا۔ آخر علاج نہ ہونا تہا نہ ہوا اس اثنا میں دوسری قوم نے جس کو ہندو کہتے تھے بہت ترقی کر لی تہی، اور نسبتاً ان میں یہ احساس زاید تہا۔ کہ اپنی معاشرت کو حکومت کی معاشرت سے مغلوب نہ ہونے دیں، اُنہوں نے نہ صرف اس کا لحاظ رکہا۔ بلکہ اسی کے ساتہہ اس نکتہ کو بہی نظرانداز نہ کیا کہ اصل راز ترقی کا صرف زبان مغرب کے حاصل کرنے میں نہیں ہے بلکہ فنون مغرب کے تحصیل میں ہے اُنہوں نے اپنی قوم کے ہونہار لڑکوں کو مغرب کے دور و دراز ممالک میں بہیجا، اور رفتہ رفتہ ان فنون کو بہی حاصل کرنے کی کوشش کی جو اسوقت تک ہندوستان سے چہپائے جارہے تھے،

اسی زمانہ میں اتفاق سے مسلمانوں کو یہ سوجہی۔ کہ خود انکی ایک یونیورسٹی ہونی چاہیئے۔ اور خود اپنا مقرر کردہ نصاب اس میں رائج کرنا چاہیئے، اس کے لئے روپیہ جمع کیا گیا۔ لیکن چونکہ حسب منشار اجازت گورنمنٹ نے نہیں دی اس لیئے وہ تجویز بہی درہم برہم ہو گئی۔ مگر ہندوں نے اپنی ایک یونیورسٹی قائم کر لی۔ اور اُنہوں نے کچھہ پرواہ نہ کی۔ کہ اس کے شرائط کیا ہیں۔ چونکہ ان کے مدارس زیادہ تھے، اور خود انکا

نہا نصاب کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ ان کا مذہبی لٹریچر عرصہ ہوا برباد ہو چکا تھا۔ اس لیئے
ان کا اس میں فائدہ تھا یہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کہ سلف گورنمنٹ کی کوششیں
کس طرح ہوئیں مسلمانوں نے کس طرح ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ پھر آخر میں مسلمانوں کو
کس قدر زک اٹھانی پڑی، اس لیئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ اس کا
اثر مسلمانوں کی تعلیم پر بھی بہت بڑا پڑا۔ اس لیئے ضمناً اس کا ذکر یہاں بھی ضروری
ہے۔ جب سلف گورنمنٹ مل گئی۔ اور ہندؤں کا اقتدار نظام سلطنت میں پیدا ہو گیا
جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ تو وہ ساری رنجشیں جو اس وقت تک دبی چلی آتی
ہیں دفعتاً نمودار ہو گئیں۔ اور اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا۔ کہ مسلمانوں کی مادری زبان
جو حقیقتاً سارے ملک کی مادری زبان تھی مٹنے لگی، ہندوؤں نے پہلے ہی اپنی سعی و کوشش
سے اس کو اس قدر ضعیف کر دیا تھا۔ کہ دفاتر وغیرہ میں تنہا اسکی حکومت باقی نہ رہی
تھی۔ بلکہ اس میں ایک اور رسم الخط کو سہیم و شریک بنا دیا تھا۔ جو ہندوؤں کے قدیم لٹریچر کے
رسم الخط کی طرح تھا۔ لیکن جب سلف گورنمنٹ ملنے کے بعد ان کے ذرایع زیادہ وسیع
ہو گئے، تو مسلمانوں کی زبان یک قلم دفاتر وغیرہ سے خارج کر دی گئی اور مسلمانوں کو
مجبور کیا گیا۔ کہ وہ اس رسم الخط کو حاصل کریں، جس کو انہوں نے کسی زمانہ میں متروک
کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسپر کسقدر برہمی پھیلی ہوگی۔ لیکن اب یہ سب بیکار باتیں تھیں
اور ان کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا، کہ وہ اپنی دوسری ہمسر قوم کی خواہشات
کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں۔ اور خود اپنی زبان کو خیرباد کہدیں۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چند
سال میں مسلمان زبان کے لحاظ سے ہندو صورت کے اعتبار سے، عیسائی اور قسمت
کی حیثیت سے وہی بدقسمت مسلمان رہ گئے، ان کے تمام حوصلے ان کی تمام امنگیں خاک
میں مل گئیں۔ نہ ان کے مدارس باقی رہے، نہ انکی مجالس قایم رہیں۔ نہ ان میں کوئی
ہادی رہا۔ اور نہ کوئی مقتدی۔ چونکہ یہ قوم اقتصادیات کی دشمن تھی۔ اس لیئے مالی حالت

پہلے ہی سے ضعیف تہی۔ اب سلب حقوق کے ساتہہ اس میں اور زیادہ ضعف پیدا ہوا۔ اور رفتہ رفتہ وہ ملبوس اور وضع قطع بہی ندارد ہوگئی جس کو انہوں نے مغرب کی تقلید میں اپنے لیے مایۂ ناز سمجہہ رکہا تہا،،

مذہب پہلے ہی رخصت ہوچکا تہا۔ دنیا یوں روٹہی۔ اول تو تعلیم پہلے ہی کم تہی۔ اور جو کچہہ تہی بہی وہ سلف گورمنٹ پر قربان کردی گئی، اب مسلمان کو وہ زمانہ یاد آیا جب اس نے اول اول مغربی زبان کی تحصیل سے گریز کیا تہا۔ اور پہر وہ مذہبی تعلیمات اس کو یاد آئیں جو اس کو صحیح تربیت کی راہ دکہانے والی تہیں لیکن جب مایوسی حد سے گذر جاتی ہے۔ تو کامیابی کا سلسلہ غیر منقطع ثابت ہوتا ہے تو انسان پریشان ہوجاتا ہے، اور پہر اس کی سمجہہ میں نہیں آتا۔ کہ وہ کیا کرے، پہر اگر مسلمانوں کی بہی یہی حالت ہوگئی تو جائے عجب نہیں لیکن اس سے کم از کم دوسری قوموں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے، کہ تعلیم صرف اسی وقت تک مفید ہوسکتی ہے جب اس سے اخلاق پر اچہا اثر پڑے۔ جو ساتہہ ہی ساتہہ تربیت کی بہی حامی ہو، ورنہ اس کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہوا کرتا ہے، ہرچند میرے برادران ملک تعلیم و تربیت کے دو جدا جدا مفہوم سمجہنے سے قاصر رہیں گے، اور شاید انہیں اس قدر شرح و بسط کے ساتہہ بیان کرنے کے بعد بہی اس کے یقین کرنے میں تامل ہوگا۔ لیکن انہیں باور کرنا چاہیئے۔ کہ جو کچہہ میں نے لکہا ہے۔ صحیح ہے، اگر مسلمان اپنی تعلیمات مذہبی کے ساتہہ ساتہہ علوم مغربی کو حاصل کرتے تو ہرگز ان میں ضعف پیدا نہ ہوتا اور ان کے قواء عملیہ کبہی بیکار نہ ہوتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے یہ انکی سزا تہی جس پر اب صرف اظہار تاسف کیا جاسکتا ہے،

بیسواں صفحہ

میری ڈائری کا یہ جزو جس کے ہر ہر لفظ کو میں نے دہرکتے ہوئے دل سے لکھنے کے بعد بھی گھنٹوں دیکھا ہے اور دنوں مبہوت و متحیر رہا ہوں۔ معلوم نہیں میرے ملک کی پبلک اس کو کس نگاہ سے دیکھے، لیکن اسمیں کلام نہیں۔ کہ ایک غیر ملک کے سیاح کے لیئے اگر ہندوستان کی کوئی چیز ایسی ہے، جو باوجود ناروا و نادرست ہونے کے بھی دلفریب و خوشنما ہے تو وہ صرف یہاں کا طبقہ لطیف اور یہاں کے اس طبقہ کا طرز معاشرت ہے۔ جو اپنے اندر خدا جانے کس بلا کی کشش رکھتا ہے اور ناخوش گوار چیز کو بھی خوش گوار تسلیم کرا دیتا ہے، میں اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ کہ موجودہ حالت اس طبقہ کی کسی واقعی ارتقا صحیح کا نتیجہ ہے یا ضلالت و گمراہی کی کھلی ہوئی صورت، مگر اس میں کلام نہیں۔ کہ ہمارے ملک کی عورتوں کو کسی بات میں ہندوستان کی عورتوں سے تشبیہ نہیں دیجا سکتی۔ یہانتک کہ میں بعض اوقات متحیر ہو جاتا ہوں۔ کہ اگر اپنے ملک کی عورتوں کو میں عورت سمجھوں۔ تو ہندوستان کے اس طبقہ کو کیا کہوں،

جس وقت اوّل اوّل میں نے ہند اور سرزمین ہند میں قدم رکھا۔ سب سے پہلی وہ چیز جس نے نمایاں طور سے مجھے، میرے دل، میرے جذبات، میری قوتوں اور میرے ارادوں کو اپنی طرف کھینچا۔ وہ وہاں کی عورت تھی۔ وہ کھلا ہوا بے نقاب چہرہ، وہ پھڑکتی ہوئی چتونیں، وہ دعوت دینے والی آنکھیں، وہ خود مختارانہ قہقہے، وہ آزادانہ کرشمے، وہ بے اختیارانہ غمزے، اور اس کے علاوہ ہزاروں اور ایسی ادائیں جس کا ہمارے ملک کی عورتوں میں کوسوں پتہ نہیں ہے، اور نہ جن کے لیئے ہماری زبان میں کوئی لفظ۔ الغرض یہ سب باتیں ایسی تھیں۔ جنھوں نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ آپ متعجب ہونگے۔ کہ کرۂ مریخ کے اس بوڑھے سیاح کو کیا ہو گیا، لیکن

آپ یقین کریں۔ کہ میں اسوقت اپنے اندر اک کہوئی ہوئی طاقت سمجھنے اور متاثر ہونے
غور کرنے اور کف افسوس ملنے کی عود کرتی ہوئی پاتا تہا۔ اور کسی طرح یہ بات سمجھہ میں نہ آتی
تہی۔ کہ میں کیونکر یہاںکی عورتوں کا حال بیان کروں اور کسی طرح یہاں کی ایک عورت
کو پکڑ کر اپنے ملک میں لے جاؤں۔ اور اس کو سامنے رکہہ کر لوگوں کو بتاؤں کہ دیکہو قرب
قیامت کی سب سے زیادہ عظیم الشان اور یقینی علامت یہ چیز ہے سو اس سے جہانتک
ممکن ہو بچو، اور قیامت کو کبہی دعوت نہ دو، کیونکہ میرے نزدیک اس سے زیادہ
تباہ کن چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہے، یہانتک کہ اگر میرے اختیار میں ہو۔ تو میں
کبہی سلطنت مریخ کو یہ مشورہ نہ دوں۔ کہ وہ اپنے دشمن ملکوں سے جنگ کرے اور اس
طرح ان پر فتوحات حاصل کرے۔ بلکہ صرف ہندوستان کی چند عورتیں پکڑ پکڑ کے وہاں
بہجوادے، پہر آپ وہ ملک چند دن میں مکہی مارنے لگے گا، اور خود تباہی کی اس حد تک
پہنچ جائے گا۔ جہاں مفتوح و مغلوب ہونا ہی بڑی کامیابی سمجہی جاتی ہے، یقیناً میں
اخفاء حقیقت کا مجرم قرار دیا جاؤنگا۔ اگر یہ ظاہر نہ کروں۔ کہ ہندوستان کی عورت بے انتہا
ذہین، نہایت تیز و ہوشیار ہے میں نہیں کہتا۔ کہ شوخ و شریر کے الفاظ سے انکی
صحیح حالت کا اندازہ ہوسکتا ہے یا نہیں ورنہ شاید میں ان کا استعمال کرتا۔ سب سے زیادہ
عجیب بات جو وہاں کی عورتوں میں دیکہی گئی۔ ان کے کیرکٹر کا عمق ہے، ہم وہاں ایک
عورت کو دیکہتے ہیں۔ اور اس کی حالت انداز و غمزہ سے سمجہتے ہیں۔ کہ یہ بہت مغرور
و سرکش ہے لیکن اسوقت جبکہ ہم یہ خیال قایم کرتے ہوتے ہیں۔ دفعتہً وہ کسی سے مخاطب
ہوتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سے زیادہ ذی اخلاق متواضع منکسر مزاج اور
کوئی نہیں ہوسکتا۔ مگر ابہی ہم یہی حکم لگاتے ہوتے ہیں، کہ وہ آدمی چلا جاتا
ہے، اور پہر ہم اس عورت کو ایک عجیب انداز سے اسپر ہنستے، اس کی حقارت کرتے اور
اس کیطرف سے منہ پہیر لیتے دیکہہ لیتے ہیں، الغرض وہ ایک آن واحد میں اس قدر متضاد

متبائن اور باہمد گر ایسے منافی مناظر کی تصویر بن جاتی ہے۔ کہ ایک شخص متحیر ہوجاتا ہے کہ آخر اسے کیا سمجھا جائے، اور اس کے کیرکٹر پر کیا حکم لگایا جائے۔ میں نے اسکی مثالیں اسقدر کثرت سے دیکھیں، کہ آخر کار مجھے مجبوراً ماننا پڑا۔ کہ ہندوستان کی عورت ایک نظر بندی ہے، ایک شعبدہ ہے۔ جس کو دیکھنے والا کبھی نہیں سمجھ سکتا، خواہ وہ کتنا ہی غور کرے،

میں نے جستجو کی کہ ہندوستان کے اس طبقہ کی حالت ہمیشہ سے ایسی ہے یا اب ہوگئی ہے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ نتیجہ ہے جدید ترین ترقی کا، اور ایسا عجیب و غریب نتیجہ ہے کہ اگر اب سے ایک صدی پہلے کی کوئی عورت لاکر کھڑی کردی جائے تو وہ اپنے ہم جنس کی یہ حالت دیکھکر شاید یہ بھی مشکل سے یقین کرے کہ یہ عورت ہی ہے۔ یا کوئی اور بلا۔ اور اگر وہ یقین کرے کہ یہ عورت ہی ہے تو شاید کبھی اس کے سامنے بے پردہ ہوکر آنا گوارا نہ کرے۔ میں نے جسوقت اپنی ڈائری کے ماسبق صفحات میں تعلیم ہند کے مسئلہ پر گفتگو کی تھی۔ اسوقت تعلیم نسوان کے مسئلہ کو قصداً نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ اس کے متعلق مجھے مستقل باب جداگانہ قایم کرنا تھا۔ لیکن یہ بات آپ کو اس جگہ بھی معلوم ہوگئی ہوگی، کہ مسلمانوں میں عام طور سے کس طرح کی تعلیم کا رواج ہوا۔ اور ہندؤں میں کسطرح، اور پھر ان دونو طبقوں پر اسکا کیا اثر ہوا،

جس زمانہ میں تعلیم کا زور ہوا۔ اور حشرات الارض کیطرح بے شمار لیڈران قوم تعلیم وقومیت کا لوائے نامساعد لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اسوقت ان میں بعض افراد ایسے بھی پیدا ہوئے۔ جنھوں نے صرف طبقہ اناث کی تعلیم وتربیت کو اپنا میدان عمل قرار دیا۔ اور اس کے لیئے اپنی زندگیاں قربان کر دیں، لیکن چونکہ بے اصولی انکے خمیر میں تھی۔ کم فہمی اور ناعاقبت اندیشی ان کے ترکیب دماغی کے تین چوتھائی حصے پر مستولی تھی، اس لیئے وہ مطلق اس بات کو نہ سمجھ سکے، کہ مرد وعورت میں کیا فرق

ہے، اور ان دونوں کے فرائض ایک دوسرے سے کسقدر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ الغرض وہ لیڈران ضعیف الدماغ بلا کوئی حد فاصل قائم کئے ہوئے دفعتاً چیخ اُٹھے۔ کہ جبتک عورتوں میں تعلیم نہ ہوگی ملک ہرگز ترقی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ مرشد اعظم نپولین کہہ گیا ہے کہ پہلے ملک کی ماؤں کو قابل بناؤ۔ اور پھر فرزندان ملک کی ترقی کا خواب دیکھو" جسوقت مک یہ اُپج نہ لی گئی تھی۔ اسوقت تک ہندوستان کی عورتیں نہایت باحیا، غیرت دار شرم وعفت کی دیویاں، ہمدردی والفت کی پتلیاں تھیں۔ ان کو یہ خبر ہی نہ تھی۔ کہ سوائے اپنے شوہر دیکھی اطاعت۔ بچوں کی نگہداشت، اور خانہ داری کے انتظام کے اور بھی کوئی فضا دنیا میں ہے جس کی انہیں خبر نہیں۔ چنانچہ اول اول جب یہ آواز بلند ہوئی، اور رفتہ رفتہ پردوں کے اندر پہنچی، تو سخت مخالفت ہوئی، اور سخت نفرت کے ساتھ اس خیال کو رد کر دیا گیا۔ لیکن مردوں کے اوپر کسی معمولی جن کا سایہ تو تھا نہیں۔ کہ یوں آسانی سے دور ہو جاتا۔ اُنہوں نے اپنے پندار میں مرض کی حقیقی علت، کام کے اصل رشتہ کو پالیا تھا۔ اور اُنہیں خدا کے وجود سے زیادہ اس بات کا یقین تھا۔ کہ اگر ملک کی حالت سنبھل سکتی ہے تو صرف عورتوں کو آزادانہ تعلیم دینے سے، یا یوں سمجھیے کہ اگر قوم قوم بن سکتی ہے۔ تو صرف عورتوں کے بگاڑنے سے،

اس میں کلام نہیں۔ کہ عورتوں نے بڑی حد تک اس کی مخالفت کی۔ لیکن وہ ضعیف جنس وہ کمزور طبقہ اس مخالفت میں زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ان کو مردوں کی خواہشوں کے سامنے سر عجز جھکا دینا پڑا۔ یہانتک کہ ضابطہ اسکول قایم کر دیئے گئے، اور وہاں عورتیں، لڑکیاں جانے لگیں۔ اور اسطرح اُنہوں نے اپنے جوہر ذاتی کو بدبخت مردوں کے اوپر سے قربان کر دینے کے لیئے پہلا قدم اپنی ڈیوڑھی سے باہر نکالا۔ اور اسی کے ساتھ مردوں میں یہ جوش بھی پھیلا۔ کہ پردہ نہایت لغو

رسم ہے۔ اور وہ بہت سی ان انسانی قوتوں کو ضعیف کر دیتا ہے۔ جن سے کام لینا عورتوں پر بھی فرض ہے۔ مگر اس میں اوّل اوّل مطلق کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہر واعظ اور ہر لیڈر دوسروں ہی کے لیئے پردہ شکنی کو امر مستحسن سمجھتا تھا۔ اور جب خود اس کے گھر کی عورتوں کا سوال آتا تھا۔ تو وہ دم بخود ہو جاتا تھا

چونکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اچھی طرح اس بات کو سمجھتا تھا۔ اور علاوہ اس کے عورتوں کی طرز معاشرت ابھی بہت کچھ اصلاح طلب تھی۔ اس لیئے یہ جنون کچھ کم ہو گیا مگر ذرا زیادہ زیرک لوگوں نے سمجھ لیا۔ کہ بے پردگی کے رواج پر زور دینا بے کار ہے حسب زیر تجویز طریقہ تعلیم کا رواج عورتوں میں ہو جائیگا۔ تو وہ خود ہی پردہ اُٹھا دینگی اور بغیر کسی مزید سعی و کوشش کے اس مقصد میں کامیابی ہو جائے گی۔ اور واقعی یہ خیال بالکل صحیح نکلا۔ جب اسکول قایم ہوئے، تو کچھ عرصہ تک وہ زیادہ آباد نہ ہو سکے۔ لیکن رفتہ رفتہ عورتوں کی وہ شریفانہ وحشت کم ہونے لگی۔ اور دولتمند طبقوں کی عورتیں اسکولوں میں داخل ہونے لگیں۔ ان اسکولوں میں زبان انگریزی کی تعلیم کے علاوہ اور وہ تمام باتیں ان کو سکھائی جاتی تھیں۔ جو ان میں حد درجہ دلفریبی و دلکشی پیدا کر دیں مثلاً موسیقی، اصول زیبائش و آرایش اوضاع واقطاع ملبوس کا علم، رقص و نغمہ وغیرہ وغیرہ افسوس ہے۔ کہ میں اس زمانہ میں وہاں نہیں تھا۔ کہ اس تدریجی ارتقا کو قلم بند کر سکتا۔ لیکن میرے بعض احباب کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ عورتیں جنکی پردہ داری شرم و حیا۔ اور عفت و حجاب کی قسم کھائی جاتی تھی۔ اُنہی کی لڑکیوں کا چند دن میں یہ حال ہو گیا۔ کہ شام کو باغ کے کوٹھوں پر جہاں زنانہ اسکول کا بورڈنگ تھا۔ رنگین آنچلوں کے پھریرے اُڑنے لگیں۔ اور جھلملیوں اور چقوں میں ایک جان ڈالدی کہ جب دیکھو وہ متحرک و بیقرار ہیں

ممکن ہے میرے ملک والے معترض ہونگے کہ اس حد تک کیا خرابی آئی۔ اگر ان میں دلفریبی اور دلکشی زیادہ ہوگئی۔ اگر وہ زیادہ فہیم و ذی ہوش ہوگئیں۔ اگر ان میں سلیقہ بڑھ گیا۔ تو کیا برائی ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے، کہ اس کا اثر کیسا ہوا۔ اور دیکھنا یہ ہے۔ کہ اندرونی زندگی میں کیا انقلاب ہوا۔ اسپر جب غور کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس لحاظ سے بہت برا اثر پڑا۔ اور ہزاروں خاندان تباہ ہوگئے اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ جب لڑکی تعلیم سے فارغ ہوکر نکلی، تو وہ خیال دماغ میں لے کر نکلی۔ کہ میں عورت ہوں، اور ایسی چیز ہوں کہ اضطراب کے لیے دنیا کا بہترین مرد بے قرار ہوسکتا ہے۔ پھر اس نے غور کیا۔ کہ جب عالم میں میں اس قدر پھیلا سکتی ہوں۔ تو میں مستحق ہوں۔ کہ تسکین اضطراب کے لیے بڑی سے بڑی قیمت طلب کروں اور پاؤں۔ اگر میں کسی سے شادی کروں اور وہ اس قیمت کو ادا نہ کرسکے تو مجھے ہر وقت حق حاصل ہے کہ معاملہ اس سے توڑ دوں۔ اور کسی اور سے کروں جو زیادہ اہل ہو۔ اول تو میں صرف اس لیے نہیں ہوں۔ کہ دنیا کی آبادی میں اضافہ کیا کروں اور اگر یہ بھی ہو تو بھی بچوں کو دودھ پلانا۔ انکی ایسی خدمت کرنا جس سے میری آرائش و زیبائش آلودہ ہو، ہرگز درست نہیں ہے۔ میں تو اس عالم میں مردوں کے برابر حقوق لے کر آئی ہوں۔ اور جسطرح وہ تمام نعایم ولذائذ سے مستفید ہوتے ہیں اسی طرح مجھے بھی ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی عورت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا، تو وہ کیا کچھ نہ کرے گی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ شوہروں سے محبت کم ہوگئی۔ بچوں کی نگہداشت کا خیال ضعیف ہوگیا۔ خلوص و ہمدردی کم ہوگئی انتظام خانہ داری سے نفرت ہونے لگی اور تھوڑے دنوں میں مرد محسوس کرنے لگے۔ کہ ہم نے عورت سے شادی نہیں کی ہے۔ بلکہ عورت نے اپنے ساتھ کی ہے اور اس کو حق حاصل جسطرح چاہے ہم کو رکھے۔ خیر اگر امراء و روسا۔ یا کسی خاص طبقہ میں یہ حالت ہوتی تو بھی زیادہ رونا نہ تھا۔ بلکہ قہر تو یہ ہوا۔ کہ وبا عام ہوگئی اور ہندوستان

لگا ہر گھر اس میں مبتلا ہو گیا۔ اب خیال فرمائیے کہ ایک غریب جو روزانہ صرف اس قدر کماتا ہے کہ سادگی کے ساتھ اپنے اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھر سکے۔ شام کو اپنی دن بھر کی کمائی بیوی کے سامنے لاکر ڈالدیتا ہے اول تو وہ نگاہ حقارت سے اس حقیر رقم کو دیکھ کر ٹھکرا دیتی ہے، اور پھر اگر ہاتھ میں لے لی تو کبھی اس کو دیکھتی ہے اور کبھی اپنے لباس کو، کبھی لانے والے کی صورت کو دیکھتی ہے، اور کبھی اپنی طرحداری کو، مطلب یہ کہ اب مجھ سے تم سے نہیں نبھ سکتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑے دنوں میں یا تو وہ غریب اس قدر مقروض ہو جاتا ہے کہ آخر کار اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے یا پھر وہ بی صاحبہ کسی دن باغ کی روشوں پر کسی دوسرے مرد کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ٹہلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اپنے رکھ رکھاؤ سے فرصت ہو۔ تو بچوں کی فکر ہو بچوں کو دودھ پلانا معیوب ہو گیا۔ کہ اس سے شباب جلد زائل ہو جاتا ہے۔ اور اسطرح اناؤں کے مصارف ایک طرف بڑھے اور دوسری طرف بچوں کی طرف سے وہ الفت کم ہوئی جو خود دودھ پلانے کی حالت میں ایک ماں کو ہوتی ہے،

الغرض تعلیم نسواں کے ساتھ یہ تمام مشکلات بڑھتی رہیں۔ اور مردوں کی دولت کا کثیر حصہ انکی دلربائیوں، عشوہ سازیوں اور ناز آفرینیوں پر قربان ہونے لگا چونکہ یہ خواہش عورتوں کی اس قدر قوی ہو گئی۔ کہ مردوں کو مجبوراً اس کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔ اور ادھر مردوں کی مالی حالت کمزور ہو گئی۔ اس لیے رفتہ رفتہ وہ زمانہ آگیا۔ کہ عورت بازار کی ایک جنس ہو گئی۔ اور اس کی محبت، اس کی راحتوں، اس کے حسن وجمال کا علی الاعلان سودا ہونے لگا۔ اور وہی کامیاب ہوا جس کے پاس زیادہ دولت ہو

وہ زمانہ جب مرد رات کو تھکا ہوا اپنے گھر میں آتا تھا۔ اور اپنی سادہ مزاج محبت کرنے والی بیوی کے پر خلوص سینہ میں سچے جذبات ہمدردی معلوم کرکے دن بھر کی خستگی کو بھول جاتا تھا۔ خواب وخیال ہے۔ اب مرد صرف دولت درسوائی خستگی

و پریشانی مایوسی و ناکامی ہے، اور عورت لطف و عیش، دولت و کامرانی، آزادی و خود مختاری جس کی حکومت دلوں پر تو نہیں، مگر خزانوں پر ضرور ہے اور جسکی تعظیم کا معیار صرف اپنی مادی کامیابی کے لحاظ سے طیار ہوتا ہے۔ خود دیکھ بھال کے، جانچ کے پرکھ کے شوہر ڈھونڈنا۔ چاروں میں اس سے اور اس کی دولت سے سیر ہو کے دوسرا سینہ تلاش کرنا۔ بچوں سے نفرت کرنا۔ باغوں میں گھومنا، گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر صحیح تمدن و معاشرت کو روندتے پھرنا جس کو جی چاہے ایک تبسم سے زندہ اور جس کو جی چاہے ایک چین بجبیں سے ہلاک کر دینا۔

یہ ہے ہند میں اس عورت کا حال جو ہمارے ہاں ہر وقت گھر میں بیٹھی غم میں کہا کرتی ہے کہ کس طرح اپنے شوہر کی تکالیف کو دور کر سکوں۔ اور کیونکر اپنے بچوں کی آرام و آسایش پر اپنی زندگی قربان کر دوں۔ میں نہیں کہتا۔ کہ دنیا کس عورت کی تعریف کرے گی لیکن کم از کم میری رائے تو یہی ہے کہ خدا میرے ملک کو اس انقلاب سے بچائے رہا لطف و مسرت عیش و تفریح کا خیال سو میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے۔ کہ جب جی چاہے گا ہندوستان ہو آیا کروں گا۔ اور بس۔

اے نپولین تو نے اپنے ملک کی ماؤں کو قابل بنا کے قوم کو درست کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں۔ کہ تو نے ہندوستان کی قوموں کو علی الخصوص مسلمانوں کو تو بالکل تباہ و برباد کر دیا

چوتھا صفحہ

میں یہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اور اپنے ہم وطنوں کو اچھی طرح سمجھا چکا ہوں۔ کہ ہندوستان کی موجودہ سلف گورنمنٹ کیونکر قایم ہوئی۔ کس قسم کا جد و جہد اس کے حصول کے لئے کیا گیا۔ اور دونوں قوموں میں کسقدر تفاوت ہے۔ ایک کیسی بلند مرتبت، متمول، ذی اقتدار اور بارسوخ ہے، اور دوسری اس کے مقابلہ میں

کسدرجہ ادنیٰ، غریب، حقیر، اور ناکارہ ہے۔ دونو کی تعلیمی حالت کا بھی ذکر کرچکا ہوں۔ اور ان کے طبقہ نسوان پر بھی کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ اور غالباً ایک سیاح ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا کی مخلوق ہونے کے لحاظ سے جو رشتہ و تعلق کرہ ارض کے باشندوں کو ہمارے کرہ مریخ کے رہنے والوں سے ہے۔ وہ مجھے مجبور کرتا ہے۔ کہ صرف واقعات کے احصار اور حوادث کے شمار پر بس نہ کروں۔ بلکہ ایک عام نظر ڈال کر کسی ایسے نقطہ پر پہنچنے کی بھی کوشش کروں جو نہ صرف کرہ ارض کے اس فلاکت زدہ۔ اور تباہ و برباد ملک (ہندوستان) کے رہنے والوں کو کچھ مدد دے سکے۔ بلکہ خود ہمارے ملک کے لیئے بھی نتیجہ خیز ہو۔ مجھے معلوم نہیں، کہ ہندوستان والے فطرت کی اس محکم ترین مدافعت کو جانتے ہیں یا نہیں لیکن میرے ملک کا ہر ہر فرد اس کا یقین رکھتا ہے۔ کہ کبھی کوئی قوم تباہ و برباد نہیں ہو سکتی۔ تباہ ہونے والی جماعت قوم نہیں ہوتی۔ بلکہ پراگندہ افراد کا ایک مجموعہ پریشانی یا ایک پریشان اجتماع ہوتا ہے جس کو غلطی سے لوگ قوم کہتے ہیں، ایک جماعت ہمیشہ اسی وقت تک قوم کہلائے گی، جبتک وہ ترقی کر رہی ہے۔ جس وقت تک وہ اپنے مقاصد و اعمال میں کامیاب ہے، اور جہاں اس میں انحطاط شروع ہوا۔ سمجھ لو۔ کہ اس سے پہلے اس جماعت کی قومیت جاتی رہی ہے، اور وہ جماعت قوم نہیں تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیوں لوگ ایک لفظ کو غلط مفہوم میں استعمال کر کے اس لفظ کی حقیقی قوت و وقعت کو زائل کر دیتے ہیں۔ بہر ایک جماعت کے ایسے افراد کو جو اپنے تئیں اجزاء قوم سمجھتے ہیں سب سے پہلے خواہ وہ کسی حالت میں ہوں۔ ترقی میں ہوں یا انحطاط میں، اوج میں ہوں یا حضیض میں، یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ آیا واقعی وہ اجزاء قومیت ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو انہیں بے فکر ہو جانا چاہیئے کہ وہ کبھی ذلیل و خوار نہیں ہو سکتے۔ اور دنیا کی کوئی قوت ان کو پامال نہیں کر سکتی۔ اور اگر نہیں ہیں، تو ان کو یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ وہ فنا ہو چکے، خواہ وہ

فنا نہ ہوئے ہوں (کیونکہ فنا کے مدارج نہیں ہیں۔ اس کا صرف ایک درجہ ہے اور وہ کچھ نہیں ہے سوائے انتزاع قومیت کے)

ہرچند مجھے اپنے ملک والوں کے سامنے اس بات کے ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہ قومیت کس کو کہتے ہیں، اور اس سے مقصود کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں تنازع قومیت، انتشار، افتراق انفکاک اور اسی قسم کے الفاظ کا جن سے "فصل وانفصال" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ وجود ہی نہیں ہے، اور اس لیئے میرے ملک والے جب تک خود ہندوستان جاکر معائنہ ومشاہدہ نہ کریں اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے، کہ باہمی نفاق وعداوت" کیا چیز ہے۔ تاہم میں کچھ نہ کچھ ظاہر کر دونگا۔ نہ اس لیئے کہ میں اپنے برادران وطن کی معلومات میں اسطرح کچھ اضافہ کرسکوں گا بلکہ اس غرض سے کہ ممکن ہے ہندوستان والے اب بھی اس حقیقت کو سمجھیں جس کو انہوں نے بہلا دیا ہے۔ اور اس صداقت سے تردد وسرکشی نہ کریں جس سے تردد وسرکشی کرنے والا کبھی زندہ نہیں رہ سکتا،

جس رسول کے ماننے والے ہم ہیں، اسی رسول کی ماننے والی وہ بدنصیب قوم بھی ہے۔ جو اسوقت ہندوستان میں سب سے زیادہ ذلیل وخوار ہے۔ اور شاید ہمارے لیئے یہ بہت بڑی وجہ ہے کہ اس کے حال پر اپنا دل دکھا ئیں۔ اور حتی الامکان اسکی مدد سے دریغ نہ کریں۔ غالباً کیا یقیناً ہم لوگوں کے لیئے یہ عجیب وغریب خبر ہوگی کہ دنیا میں ایک ایسی قوم بھی ہے۔ (میں نے قوم کہا ہے صرف منتشر جماعت کہنا چاہیئے۔ جو اپنے تئیں محمدؐ کی پیرو بتاتی ہے۔ اور پھر وہ اس درجہ حقیر وخوار ہے۔ مگر نہیں یہ ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اور لامحالہ ہم کو اسپر ازبس متحیر ومتعجب ہونا پڑتا ہے،

مجھے خود اپنے ملک کی تواریخ کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ جسوقت تک محمدؐ کی تعلیمات ہم تک نہ پہنچی تھیں۔ ہماری کیا حالت تھی اور ہم کیا پیرتھے ہمارے ہاں کے آتشی طبقہ نے جو جو مظالم خود اپنے ہی شعلوں (قبیلوں) پر

کئے تھے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، لاکھوں غیر آباد مقامات جہاں کی خاکستر بھی کرہ ارض کے اوپر آتشیں تودوں اور شعلہ بار پہاڑوں کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے شاہد ہیں کہ جو کیفیت نوری طبقہ کی تھی وہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس کی سیاہ کاریوں سے دنیا کی کتنی راتیں بنیں، اور ابتک ختم نہیں ہوئیں اور سلسلہ برابر جاری ہے۔ لیکن بایں ہمہ جب ہمارے اندر وہ پیکر نور پیدا ہوا جس کے ظل کو زمین والے محمدؐ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس پیکر نے ہمیں قومیت و اخوت مودت و محبت کی تعلیم دی، تو ہماری حالت دفعتہً بدل گئی۔ یہانتک کہ آج بھی باوصف اس کے کہ اس پیکر نور کو فضائے فطرت میں تحلیل ہوئے زمانہ گذر گیا۔ ہم کو خبر نہیں۔ کہ ایک ہستی کے دو پہلو کیونکر ہو سکتے ہیں۔ اور وہ کیا چیز ہے جس سے کثرت کا مفہوم اختلاف اعداد کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں مفہوم زندگی صرف ہمارا دل ہے اور ہماری ساری ہستی اس دل کی بدولت ہے اگر ہم کو اللہ نے ایک خاص قوت امتیاز باہم ایک دوسرے کو پہچاننے کی نہ دی ہوتی۔ تو ہم ایک دوسرے کو پہچان ہی نہ سکتے۔ کیونکہ ہم لوگ سب دل ہیں۔ اور دل میں بھی متعدد نہیں۔ بلکہ صرف ایک۔ پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہی تعلیم ایک جگہ تو باہم ایسا وصل کردے اور دوسری جگہ ایسا فصل، ایک جگہ وہ ایسے شدید اجتماع کی شکل میں ظاہر ہو اور دوسری جگہ اسد درجہ سخت انتشار کی کیفیت میں، حقیقتاً ایک بڑا راز ہے جس کو زمین والے بہت کم سمجھتے ہیں۔ اور جو چند سمجھنے والے ہوئے بھی تو انہوں نے زیادہ اعتنا اس طرف نہیں کیا علاوہ اس کے زمین والے اپنے تعلق کے لحاظ سے بھی ایک حد تک ہم سے پیچھے ہیں اور یہ ایک سبب اور بھی انکے دھوکہ کھا جانے کا ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ محمدؐ تمام مخلوقات عالم کے لئے مبعوث ہوئے تھے خواہ وہ کہیں ہو۔ اور کسی کرہ میں آباد ہو۔ اور اسی مخلوق کے لحاظ سے ان کا ظہور بھی ہر جگہ جداگانہ طریقہ سے ہوا۔ چونکہ اصل ذات نبی نور محض ہے، اس لئے وہ مخلوق (یعنی ہم) جو عالم ادنےٰ سے بالاتر تھی۔ اور عالم

اعلیٰ کی نورانی مخلوق کہلاتی تھی۔ اس کو زیادہ موقعہ ملا۔ کہ وہ اس نور محض کے مطالب کو سمجھے۔ کیونکہ ایسی مخلوق کا تعلق مجرد ذات نور سے زیادہ قریب و متصل تھا۔ برخلاف زمین والوں کے جو اجسام کثیفہ رکھتے ہیں۔ کہ وہ نور کی زبان اور عالم نور کی ہدایات و تعلیمات کو اس خوبی کے ساتھ نہیں معلوم کر سکتے، چونکہ زمین والوں پر اس نور محض کا ظہور انہیں کے سے ایک جسم کیصورت میں ہوا تھا۔ اس لیئے کرۂ ارض والوں نے یہ سمجھا۔ کہ حقیقتاً اس کی تعلیم بھی ہماری اس دنیائے مادی و کثیف کی سی تعلیم ہوگی نہ کہ کچھ اور، حالانکہ سب سے بڑی غلطی یہی تھی جس میں زمین والے مبتلا ہوگئے، اور آخر میں تباہ و برباد، جس وقت تک ان لوگوں نے اس راز کو سمجھا۔ اور رسول اللہ کی تعلیم کو صرف ارشاد زبانی کیطرح نہیں سنا۔ بلکہ اس سے اپنے لیے عملی زندگی کی راہیں بنائیں۔ اسوقت تک انہوں نے حکومت بھی کی۔ ان کے پاس دولت بھی رہی۔ اقبال بھی ان کا ساتھی رہا، عزت و سطوت بھی ان سے وابستہ رہی۔ لیکن جب انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کرنا شروع کیا۔ تو ان میں زوال بھی شروع ہوگیا۔ یہانتک کہ اب وہ کیفیت ان میں بالکل مفقود ہوگئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ذلت و خواری کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ جو درجہ صفر سے خدا جانے کے درجہ گرا ہوا ہے۔ ہم تو اس کا قیاس بھی پوری طرح نہیں کر سکتے۔ میرے ملک والے اس کو ابھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکے ہونگے کہ یہ کیا بات ہے۔ اور ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر میں انہیں ذرا تفصیل سے بتاؤں گا۔ کہ میرا مقصود کیا ہے

ہمارے ملک میں تو یہ کیفیت ہے۔ کہ یہاں کوئی زبان ہی نہیں ہے سوائے حرکات کے اب میری یہی ڈائری ہے کہ کوئی تحریر نہیں ہے۔ اور نہ تقریر۔ بلکہ وہ مجموعہ ہے میری حرکات کا۔ زمین والے سمجھے ہونگے کہ میں نے یہ حالات لکھے ہیں، حالانکہ یہاں کا لکھنا بھی صرف ایکٹ کرنا ہے۔ جس کو زمین والے سمجھ،

ای نہیں سکتے، کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے) بہرحال ہمارے ملک کی زندگی تو بالکل حرکت و عمل ہے، جب کوئی شخص کسی کام کو کرنے لگتا ہے۔ تو ہم سمجھتے ہیں۔ کہ یہ کچھ کر رہا ہے، ورنہ اس سے قبل ہم سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی کیا کرنے والا ہے۔ برخلاف اس کے زمین والوں کی زندگی میں یہ بات نہیں ہے۔ ان کے ہاں کی زبان کچھ اور ہے اور حرکات و اعمال کچھ اور، سب سے پہلے جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ارادہ کرتے ہیں (ارادہ کیا؟ اس کا سمجھانا ذرا مشکل ہے، بس یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ جبتک وہ کسی کام کو کرنا نہیں چاہتے ہیں وہ صرف ارادہ کہلاتا ہے) اس ارادہ کا اظہار اپنی زبان سے کرتے ہیں (اعضاء سے کوئی تعلق اس فعل کا نہیں ہوتا جس کا ذکر وہ زبان سے کر رہے ہیں) اور کرتے جاتے ہیں، یہانتک کہ وہ قوت جو تحریک جوارح میں صرف ہونی چاہیئے تھی، صرف کہنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور وہ انسان بیٹھ جاتا ہے، اسی کا نام ان کے ہاں سعی و کوشش بھی ہے مثلاً ایک شخص پانی پینا چاہتا ہے۔ یا کہیں جانا چاہتا ہے۔ تو وہ پہلے اس فعل کا خیال اپنے دل میں کرے گا۔ اسے بار بار زبان سے کہے گا (جس کو وہ ارادہ سعی و کوشش کہتے ہیں) اور پھر کہیں جا کر مشکل سے اس کو کرے گا،

ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ جب کوئی کام ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہونے والا تھا۔ ہرچند یہ حرکات ہماری بالکل اضطراری ہوتی ہیں۔ اور ہمارے ملک والے فطرتاً اس طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ تاہم زمین والے بھی اسپر مجبور ہیں۔ کہ وہ کسی کام کو کریں نہیں۔ بلکہ صرف اس کا زبانی ذکر کیا کریں۔ اور یہی وہ خاص بات ہے جس نے ایسا تباین ہم میں اور ان میں پیدا کر دیا ہے

وہی مجموعۂ تعلیمات جس کو زمین والے قرآن کہتے ہیں۔ ہمارے لیئے بھی ہے اور اسی پر ہمارا عمل ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس کا اعلان محض حرکات

سے کیا گیا۔ اور زبین والوں میں زبان سے ہی یعنی ان کو بتایا بھی گیا۔ اور سکھایا بھی گیا۔ لیکن چونکہ وہ مخلوق الفاظ سے زیادہ کام لیتی ہے۔ اس لیئے اس نے سمجھا۔ کہ اس مجموعہ کو صرف پڑھنا۔ اور پڑھتے رہنا۔ اصل مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ حالانکہ یہ اُنکی سخت غلطی ہے فرض کرو۔ کہ وہ لوگ زبان سے تو کہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے ملے جلے رہو۔ اخلاق کو پاکیزہ بناؤ۔ اور حال یہ ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور اخلاق بدستور ویسے ہی گندے ہیں پھر کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس مجموعہ تعلیمات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ایک شخص کتاب میں یہ پڑھتا ہے۔ کہ جب دو چیزیں آپس میں رگڑ کھاتی ہیں۔ تو آگ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کو آگ پیدا کرنے کی ضرورت ہو۔ اور وہ دو پتھر کے ٹکڑوں کو لے کر صرف یہی سنایا کرے کہ "جب دو چیزیں رگڑتی ہیں تو آگ پیدا ہو جاتی ہے" تو کیا یہ ممکن ہے۔ کہ وہ پتھر کے ٹکڑے یہ سنکر از خود رگڑ کھا جائیں گے، اور آگ پیدا کر دینگے اس قوم کے واعظین کا بالکل یہی حال رہا۔ اُنھوں نے ہمیشہ اخلاق کی تعلیم دی لیکن خود اُنھوں نے اپنے اخلاق کبھی درست نہیں کئے۔ حریت و آزادی کا راگ ہمیشہ گایا گیا لیکن اُنھوں نے اپنی روح کو کبھی اس قید سے آزاد نہیں کیا۔ جو ہمیشہ عصیان اور فسق و فجور کی صورت میں ان کو جکڑے رہی

اُنھوں نے زبانوں سے تو کہا۔ کہ ہم تمہارے ہی خواہ دوست اور ہمدرد ہیں (؟) کیا کیا ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی خیر خواہی نہیں کی کبھی دوست نہ ہوئے اور کسی وقت ان کے دلوں میں اپنے ابنائے جنس کی طرف سے ہمدردی اور محبت پیدا نہیں ہوئی۔ اور پھر تماشہ یہ کہ خود اس جماعت کے اکثر افراد نے ایک وقت میں اسکو اچھی طرح محسوس کر لیا۔ لیکن پھر بھی وہ کچھ نہیں کر سکے،

اس کی وجہ صرف یہی تھی۔ کہ ہر شخص دنیا کو صرف اپنے وجود سے پیدا ہوا سمجھتا تھا۔ یعنی وہ سمجھتا تھا۔ کہ میں ہی نوع زمین ہوں۔ اور ایک وقت معینہ کے بعد مر کے چلا جاؤں گا،

ضرورت کیا ہے کہ ان جھگڑوں میں پڑوں۔ اور خواہ مخواہ کا دردِ سر مول لوں۔ وہ لوگ اس سے واقف ہی نہ تھے۔ کہ اجتماعی زندگی ملی حیات، قومی محبت و بہبود کیا چیز ہے اور ایک کے حقوق دوسرے پر کس قدر ہیں اگر کوئی اصلاح کا دعوے لے کر اٹھتا تھا۔ تو اس کا مدعا واقعی اصلاح نہ ہوتا تھا۔ بلکہ صرف ذاتی غرض کا پورا کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اور وہ غرض کسی کی تو یہ ہوتی تھی۔ کہ دولت حاصل کرے، کوئی صرف ناموری چاہتا تھا۔ کوئی صرف حکام اور ارباب حکومت کے ہاں رسوخ پیدا کرنے کا خواہشمند ہوتا تھا الغرض ہر شخص اپنی جگہ ایک مستقل غرض بن گیا۔ اور دوسروں کی طرف سے بالکل مستغنی و بے پرواہ۔ دلوں سے درد، سینوں سے گداز جاتا رہا، اور اسطرح وہ تنہا ذریعہ جو قرآن پر عمل کرانے میں معاون ہو سکتا تھا۔ ہاتھ سے نکل گیا۔ یوں تو مسجدیں آباد نظر آتی تھیں۔ پیشانیوں پر سجدوں کے نشان بھی دور سے نظر آتے تھے۔ صورت بھی ہر طرح مردم فریب تھی۔ لیکن ان کے یہ اعمال بھی حقیقی روح عمل کے مقابلہ میں ویسے ہی تھے جیسے انکی زبان اقوال اعمال کے مقابلہ میں، جسطرح وہ صرف زبانی ذکر کر کے اپنے اندر کوئی ولولہ عمل کا پیدا نہ کر سکتے تھے۔ اسی طرح وہ عمل کر کے بھی روح عمل کو نہ پا سکتے تھے اور اس کی وجہ یہی تھی۔ کہ وہ بغیر کئے ہوئے سب کچھ حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ اور بغیر چلے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جانے کی تمنا رکھتے تھے، انھوں نے نمازیں پڑھیں صرف اس لئے کہ ایسا کرنے کا حکم ہے۔ حالانکہ انھوں نے اسپر غور نہیں کیا۔ کہ صرف چند بار اٹھنے بیٹھنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی حقیقی کیفیت طاری نہ ہوئی۔ سو اس کا کہیں کوسوں پتہ نہ تھا، اور انکی حالت بعینہ اس بیل کی سی تھی۔ جو رات دن چلتا تو ہے۔ مگر رہتا ہے کولھو کے آس پاس،

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ زمین والے اس کے اہل ہی نہ تھے۔ تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن وہ ترقی اسوقت کر سکتے ہیں۔ جب رسول اللہ کی تعلیمات کو پیش نظر رکھیں

اور کوئی قدم اس کے خلاف نہ اٹھائیں۔ وہ زبان سے نہ کہیں کہ تعلیمات کیا ہیں۔ وہ صرف زبانی دوسرے کو نہ سمجھائیں۔ کہ ان کا کیا مقصود ہے۔ بلکہ اسپر عمل کریں۔ اور خود عمل کرکے دوسروں کو بتائیں۔ لیکن انسے اس کی امید رکھنا فضول ہے۔ مجھ میں انکی حالت دیکھ کر کیسا کیسا جوش پیدا ہوا۔ اور کیسا کیسا جی کڑھا۔ لیکن کوئی صورت نہ تھی کہ میں ان کو بتاتا۔ اور اپنے مافی الضمیر سے ان کو آگاہ کرتا۔ کیونکہ میرے ہاں مافی الضمیر ظاہر کرنے کا طریقہ صرف ایک عمل ہے۔ اور وہ اس کے عادی نہیں ہیں خاموش ہو رہا۔ کیا کرسکتا تھا،

مگر اے برادران وطن میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ ہمیشہ اسوقت سے بچاؤ مانگنا جب تمہارے دلوں میں قبل کسی کام کرنے کے صرف ارادہ پیدا ہو، کہ اس ارادہ اور اس تفریق نے ہندوستان کی ایک بڑی اور زبردست قوم کو بالکل تباہ و برباد کر ڈالا،

پانچواں صفحہ

میں برادران وطن کے سامنے اس وقت تک وہ اپنی تمام معلومات نہیں پیش کرسکا جو میری ناچیز سیاحت کے زمانہ میں مجھے حاصل ہوئیں۔ اور جنکا اظہار میں ہر اس قوم کے لیے مفید خیال کرتا ہوں جس کو اگر ترقی کا خیال نہیں ہے تو کم از کم وہ فنا ہو جانے کو بھی پسند نہیں کرسکتی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل مدعائے سخن کا آغاز کروں۔ بصورت تمہید اتنا عرض کردینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ کہ کائنات کا ہر واقعہ عام اس سے کہ وہ کسی ترقی یافتہ قوم سے متعلق ہے یا وحشی طبقہ سے ہمارے لیے صرف ایک پہلو توجہ والتفات کا رکھتا ہے، اور وہ پہلو وہی ہے۔ جسپر غور کرنا تو آسان ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن نتیجہ تامل پر عمل کرنے کے لیے ہمیشہ کاہل و غافل ثابت ہوتے ہیں یاد رکھو۔ کہ عالم میں اس سے زیادہ سہل کوئی بات نہیں۔ کہ ایک قوم محض اپنے اطوار و

کردار کیوجہ سے کوئی نمایاں ترقی کرے۔ اگر وہ اس کی اہل ہے کہ وہ اپنی قوت تمیز کو کام میں لاکر صالح کو فاسد سے جدا کرسکے، لیکن تجربہ ثابت کرتا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی سب سے زیادہ دشوار امر ہے، ہماری ضروریات انقلابات دہر، اتفاقات زمانہ ہمیں اپنے مرزبوم سے جدا کرکے کسی ایسی جگہ لے جاتے ہیں، جو ہمارے لیئے بالکل بیگانہ ہے۔ اور اول اول ہمیں وحشت ہوتی ہے۔ کہ ہم کیونکر یہاں زندگی بسر کرسکیں گے لیکن رفتہ رفتہ وہ وحشت کم ہوتی ہے۔ اور ہوتی جاتی ہے، یہانتک کہ ایک ربع صدی کے اندر ہی اندر سارے مدارج طے ہوجاتے ہیں، اور دیکھا جاتا ہے کہ ہم سے زیادہ داد دینے والا۔ ہم سے زیادہ قدر کرنے والا۔ ان خصائص و عادات کا کوئی نہیں ہے جن سے زمانہ نے ہمارا تعارف کرایا تھا،

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ یہ امر خلاف فطرت ہے، نہیں بلکہ یہ عین اقتضاء فطرت ہے لیکن ہم کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ فطرت کا کوئی اقتضاء، طبیعت و مزاج کا کوئی میلان، ایسا نہیں ہے۔ جو ہمارے ضمیر، ہماری فکر، ہمارے غور و تامل کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہو۔ یہ ہماری سخت کمزوری ہے۔ کہ کسی امر کے اختیار کرنے میں اپنی ذہانت و تدبر کو صرف اس حد تک استعمال کرتے ہیں جس حد تک ہماری خواہشات نفس ہمارے داعیات قلب کو صدمہ نہیں پہنچتا، مثلاً اس لیئے یقیناً یہ امر خطرناک ہوگا۔ کہ میں کسی ملک یا کسی قوم کی تاریخ تنزل اپنے ملک والوں کے سامنے بیان کروں۔ بغیر اس کے کہ میں پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھا دوں۔ کہ یاد رکھو۔ کہ کوئی نئی بات اختیار کرنے کے قابل نہیں۔ جب تک اس کے نتائج کیطرف سے ہمیں اطمینان کلی حاصل نہ ہوجائے۔ خواہ اس کے ظاہری اثرات کتنے ہی دل خوش کن کیوں نہ ہوں، یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ ایک معصوم کے سامنے معاصی کی برائیاں بیان کرنا خوب نہیں۔ کیونکہ اسطرح حقیقۃً اس کے معلومات میں ایسی باتوں کا اضافہ کرنا ہے۔ جن سے وہ بالکل آشنا نہیں۔ اور

بالکل ممکن ہے۔ کہ فطرت وطبیعت جو متجسس واقع ہوئی ہے۔ جو ہر نئی بات کیطرف راغب ہوجاتی ہے۔ اس کو ان ہی معاصی میں آلودہ کردے جن کی برائیاں اس سے بیان کی جاتی ہیں

چنانچہ آپ لوگونکو یہہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوگی۔ کہ قانون کیا چیز ہے ہمارے ملک میں نہ کوئی قانون ہے نہ تعزیرات اور یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ جرائم ہوتے ہی نہیں جنکا ذکر اور ممالک کے قانون میں ہے۔ اور جن کو خود قانون نے رائج کیا ہے ایک وحشی قوم جو تمدن سے آشنا نہیں ہے جس کو معاشرت کی ترقی کی ہوا نہیں لگی، یقیناً اس کی فطری سادگی۔ اور جبلی معصومیت فنا ہوجائے گی۔ اگر اس کو یہ بتایا جائے گا کہ دیکھو چوری نہ کرنا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ اس علم سے ان کے دماغ کو ایک نئی بات حاصل ہوگی۔ اور وہ معلوم کرینگے کہ ایسا ہی دنیا میں ہوتا ہے۔ اور اس لیئے بالکل ممکن ہے کہ کسیوقت وہ جھوٹ ہی بولنے لگے، اور چوریاں ہی کرنے لگے،

اس لیئے میں اپنے ملک والوں کے سامنے اپنے واقعات حیات بیان کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کہ کہیں ان میں وہ جدید باتیں نہ پیدا ہوجائیں، جن سے وہ آشنا ہی نہیں اور جنکا وجود یا امکان وجود ان کے نزدیک بالکل حالت انحدام میں ہے۔ لیکن کیرکٹر (سیرۃ) کی اس مضبوطی کا خیال کرتے ہوئے جو میرے برادران وطن میں پائی جاتی ہے اور اس ترقی کو دیکھتے ہوئے جو نہایت صحت مذاق اور دقت نظر کے ساتھہ ہمارے ملک نے اس وقت تک حاصل کرلی ہے۔ میں یہ جرات کرتا ہوں۔ اور بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کرۂ ارض میں یہ عدم مساوات۔ یہ نشیب وفراز۔ یہ بوقلمونی یہ نیرنگی۔ یہ تفریق حال کیوں ہے۔ میں اس سے قبل کافی شرح وبسط کے ساتھہ بیان کرچکا ہوں۔ کہ اس کرہ میں ایک خاص ملک ہندوستان میں کیا کیا انقلابات ظہور پذیر ہوئے، اور اور ان کے اسباب کیا تھے۔ میں یہ بھی اسی ضمن میں بیان کرچکا ہوں۔ کہ وہاں کی تعلیمی

سیاسی، اور معاشرتی حالت نے کن اثرات کے زیر اثر انقلاب کو قبول کیا، اور رفتہ رفتہ وہ کس حد تک پہنچ گئے، لیکن میں اس حصہ میں صرف ان تدابیر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے بہت کچھ تلافی مافات ہو سکتی ہے، اگر ہند کی قوم چاہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ اگر ہمارے برادران ملک کو خدانخواستہ کبھی ان تدابیر کی ضرورت پڑ جائے تو وہ آسانی کے ساتھ اختیار کر سکیں

یہ تو آپ حضرات کو معلوم ہو چکا ہو گا۔ کہ ہند کی تنہا خدا پرست قوم نے کسقدر اپنے کو ذلیل کر لیا ہے۔ اور اب اس کے لیئے کسقدر دشواریاں ہیں۔ تاہم اگر وہ کوشش کریں۔ اور ان تدابیر پر غور کریں جن سے ان کا صحیفہ آسمانی لبریز ہے تو اب بھی وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جب میں نے دیکھا۔ کہ باوصف اس ادعائے کہ وہ خدا پرست ہیں۔ باوصف اس نخوت پندار کے کہ عالم میں صرف انہی کا مذہب راستی کا حامل ہے۔ ان سے زیادہ مشرک، ان سے زیادہ خدا کی توہین کرنے والا۔ ان سے زیادہ کجرو۔ ان سے زیادہ رہ راست سے ہٹا ہوا۔ اور کوئی نہیں ہے ان کے مذہب نے انہیں صداقت کی تعلیم دی۔ مگر انہوں نے اس سے یکسر انحراف کر لیا ان کے دین نے ان کو محنت و جانفشانی کا درس دیا۔ لیکن ان سے زیادہ کاہل و غافل اور کوئی نہیں ہے۔ ان کے بانی مذہب نے اپنے وجود کے ذریعہ سے ایک نہایت مکمل اور سچا نمونہ انسانیت کا پیش کیا۔ لیکن اس خود سر قوم نے ان خصوصیات کو بالکل فراموش کر دیا۔ اور صرف یہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ دوسری اقوام کے عادات و اطوار اس نے اختیار کر لیئے اور کبھی اس نے خیال بھی نہیں کیا، کہ ایک قوم سے مراد صرف اس کے خصائل ہیں۔ اور کچھ نہیں،

سب سے پہلی چیز جس کو اس نے ترک کیا۔ معاشرت کی سادگی تھی۔ حالانکہ مذہب کے زمانہ ابتدائی میں جس کو انتہائے عروج کا زمانہ کہنا چاہیئے۔ یہی ایک خصوصیت تھی

جسکا اثر۔ صرف اس کی معاشرت پر پڑتا تھا۔ بلکہ اقتصادی حالت اور سیاسی زندگی بھی اس کے زیر اثر اپنا کام کر رہی تھی۔ بانی مذہب کے بعد تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا۔ کہ اس قوم کی سادگی رفتہ رفتہ بالکل معدوم ہو گئی۔ اور ان میں وہی دور از کار تکلفات معیشت و حیات پیدا ہو گئے جنکا اثر اس وقت تک تو کچھ بہت زیادہ معلوم نہیں ہوا لیکن آگے چل کر پتہ چلا۔ کہ یہ ایک سخت مرض تھا جسکا انجام ہلاکت اور صرف ہلاکت ہی ہو سکتا ہے

وہ سر جو صرف ایک معمولی دستار کے نیچے ہزاروں مسائل حکمیہ اور رموز مملکت سمجھ لیا کرتے تھے زر اندود و مطلا دیہیم کے ساتھ اس قابل ہی ثابت نہ ہوئے کہ وہ صرف اس تاج کی عزت قایم رکھ سکتے، چہ جائیکہ کوئی پیشقدمی کرتا۔

وہ تن جو ایک سادہ ملبوس۔ ایک معمولی قبا کے اندر سرعت برق کو شرماتے تھے، مکلف عباؤں اور جواہر کار لباسوں کے ساتھ اس حرکت جسم کو بھی کھو بیٹھے جو صرف اپنا پیٹ پالنے کے لیئے ضروری تھی،

کام سے پہلے ہی انسان کا جسم تھک جاتا تھا۔ افکار غور و تامل سے پہلے ہی انسانی دماغ خستہ و مضمحل ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اس کا ازالہ فرش خاک پر، پتھر کی چٹانوں پر آسودگی کے ساتھ محو خواب ہو جانا تھا۔ اور کچھ نہیں۔ دن کی خستگی دور کرنے کے لیئے صرف وہ رات کے اطمینان و سکون کو کافی سمجھتے تھے۔ وہ آسمان کی نیلگوں گہرائی میدانوں کی سادگی و ہمواری جگمگاتے ہوئے تاروں کی ٹھنڈی روشنی، اور مہتاب کی خنک رعنائیوں کو دیکھتے۔ اور وہ کچھ سکون و تازگی اس سے حاصل کر لیتے۔ کہ صبح کو وہ اپنے اندر ایک نئی روح پاتے، اور پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے،

لیکن جب مناظر فطرت سے کسب سکون کا رواج ان میں باقی نہ رہا،

جب ان قدرتی ذرائع کو انہوں نے اضمحلال وحشت کی دور کرنے کے لیے ناکافی سمجھا تو ان کا وقت بہت کچھ اس فکر میں ضایع ہونے لگا۔ کہ کیونکر یہ حرص پوری کی جائے اس میں شک نہیں کہ اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ دنیا میں بہت سی نئی باتیں پیدا ہو گئیں لذتوں کے ذرایع۔ مشاغل تفریح کے اسباب بہت کثرت سے رونما ہونے لگے لیکن اس کے ساتھہ انہوں نے اپنی اس وحشت وعصبیت اور اس سادگی و آزادی کو بھی خیرباد کہدیا۔ جو ایک قوم کی ترقی کا حقیقی راز ہے۔ پھر بھی یہ سراسر نہیں ہوا۔ کہ کسی حد تک جاکر وہ بندگان لذت و مسرت بس کرتے۔ بلکہ انکی حرص اور بڑھتی گئی۔ اور انکا سارا وقت اسی میں صرف ہونے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس میں ضعف ہونے لگا۔ اور وہ غفلت کی حالت بڑہ گئی جو ظاہر میں امن وسکون ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اسمیں سکون موت ہے، اور امن فنا میں اگر آپ لوگوں کے سامنے بیان کروں۔ کہ ان کے مشاغل تفریح کیا ہیں وہ کسطرح اپنا وقت بسر کرتے ہیں، تو آپ لوگوں کو حیرت ہو جائیگی۔ اور قیامت تک آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ کہ یہ کیا بلا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے ہاں شادی ہوتی ہے، تو وہ اظہار مسرت میں سب سے پہلے جس چیز کیطرف توجہ کرتا ہے وہ رقص وسرود ہے آپ رقص وسرود کو نہ سمجھیں گے۔

یہ گفت گو کا ایک خاص طریقہ ہے جس کے لیے خاص طور سے گلا تیار کیا جاتا ہے، اور ایک ایک لفظ بہت کہا پھرا کر آواز کو اونچا نیچا کرکے گھٹا بڑھا کے اور کھینچ تان کے نکالا جاتا ہے، اور اسی آواز کے ساتھہ جسم کو حرکت دی جاتی ہے، کمر میں بل پیدا کئے جاتے ہیں، پھر اس کے ساتھہ اور بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، جن کو ساز کہتے ہیں اور جو اس آواز کا ساتھہ دیتے ہیں، یہ خدمت اکثر وبیشتر عورت کے سپرد کی جاتی ہے اور وہ بھری محفل میں یہ حرکتیں کرتی ہے، اس عورت کو مغنیہ اور رقاصہ کہتے ہیں جو دولت کا بہت حصہ کرکے آوازیں اپنے گلے میں پیدا کرتی ہے، اپنے دوران سیاحت میں میں نے

اپنے کانوں سے ان آوازوں کو سنا۔ اپنی آنکھوں سے ان حرکات کو دیکھا۔ لیکن اب باور یقین کریں۔ کہ میں ایک منٹ سے زیادہ نہ سن سکا، نہ دیکھ سکا۔ میرے کانوں کو سخت تکلیف پہنچی، اور میری بینائی کو اسیقدر ایذا،

میری سمجھ میں کسیطرح یہ بات نہ آئی کہ آخر انھیں اس میں کیا لطف آتا ہے محض آوازوں کے لیے جو قدرت کیطرف سے مفت عطا ہوئی ہے۔ یہ لوگ بیدریغ اپنی دولتیں لٹا دیتے ہیں۔ مگر نہیں وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور تباہ ہوتے ہیں جائدادیں فروخت کرینگے قرض لیں گے۔ مگر یہ بگاڑی ہوئی آوازیں ضرور سنیں گے۔ مذہب نے اس کی سخت ممانعت کردی اور ان کے بزرگوں کے عہد میں کبھی اس کا رواج نہیں ہوا۔ لیکن دوسری قوموں سے مل کر انھوں نے اس کو سیکھ لیا۔ اور عادی ہوگئے،

ایک بات اور سنئے، ہمارے ہاں تو جنس یہ نظام ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو وہ غائب ہوجاتا ہے۔ اور پتہ نہیں چلتا۔ کہ وہ کہاں گم ہوگیا۔ ممکن ہے کہ وہ ہوا میں بجاتا ہو، جیسا کہ بعض حکماء مریخ کا خیال ہے، بہر حال جو کچھ ہو۔ ہم مرجانے والے کے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرتے۔ کہ اس کے صفات اور خصوصیات کو اپنی یادداشتوں میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے جو کچھ بھی صرف ہو۔ ہم گوارا کرلیتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں یہ دستور نہیں ہے۔ وہاں جب جسم کو زمین کے اندر حفاظت سے رکھدیتے ہیں۔ تو پھر انکی ساری کوشش اس میں صرف ہوتی ہے۔ انکا سب سے بہتر طریقہ مردہ کی روح کو تکلیف پہنچانے کا کیا ہے۔ وہ اس کی جمع کی ہوئی دولت کو فضول مراسم میں ضایع کرتے ہیں۔ یہانتک کہ اولاد بعض اوقات بالکل غریب اور مفلس رہجاتی ہے، تعلیم و تعلم کا کیا ذکر۔ کہ اس کا وہاں وجود بھی نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف عورتوں کے طبقہ میں۔ اور وہ بھی صرف اسیقدر جو ان کے تباہ و برباد کرنے کے لئے ضروری ہو،

الغرض ان کے جو عادات و خصائل بھی ہیں۔ سب اسی انداز کے ہیں۔ اور ان کو مطلق باک نہیں ہوتا، کہ وہ اپنے تئیں خود تباہ کر ڈالیں۔

دوسری وجہ جو اس سے کم حاج نہیں ہے۔ ان کا فنون صنعت و حرفت سے بیگانہ رہنا۔ ان کے ہاں سب سے بڑا ذریعہ کسب معاش کا "ملازمت" ہے، یہ بھی ہمارے برادران ملک کے لیے بالکل نئی چیز ہے۔ ملازمت کہتے ہیں۔ اپنے وقت کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر ڈالنا، اور نہ صرف وقت کو بلکہ اپنے جسم کو اور روح کو،

خریدار کو اختیار ہوتا ہے کہ جس طرح چاہے کام لے، اور اس کو خلاف ضمیر کام کرنے پر بھی مجبور کرے، اس کا جو کچھ معاوضہ ملتا ہے وہ بہت کم ہوتا ہے، لیکن وہاں کے رہنے والے اس غلامی کے لیے جان دیتے ہیں۔ اور اس کو سب سے بہتر خیال کرتے ہیں، چونکہ ہمارے ہاں یہ رواج بالکل مفقود ہے، اس لیے غالباً میں کسی طرح نہ سمجھا سکوں گا۔ کہ واقعی نوکری یا ملازمت کیا چیز ہے، بس اس کو اسطرح سمجھ لو۔ کہ جیسے کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈالدیا جائے۔ پھر اسی کے ساتھ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ضروریات زندگی کے لیے ہر شخص کو دوسرے کا محتاج بننا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ رسم ہے کہ ہر شخص اپنی ضروریات زندگی کو خود مہیا کرتا ہے، یعنی پیدا کرتا ہے ہم خود ہی غلہ پیدا کرتے ہیں۔ اور کھاتے ہیں۔ اور خود ہی کپڑا بنتے اور پہنتے ہیں، لیکن وہاں یہ دستور ہے کہ ضروریات مہیا کرنے کے لیے ایک خاص چیز بنائی گئی ہے جس کو روپیہ کہتے ہیں، اور اس کی قیمت قرض کرلی گئی ہے، جس سے ان اشیا کی فراہمی میں مدد لی جاتی ہے، ملازمت کرنے والے خود بھی اپنی غلامی کا عوض اس روپے کی صورت میں پاتے ہیں، اور خود دوسروں کو بھی اپنی ضروریات کے لیے یہی دے دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ نقصان ہے کہ نفع غلامی یوں مفت و بیکار ضایع جاتا ہے۔ بلکہ انسان بدستور دوسرے کا محتاج دوست نگر بنا رہتا ہے، کرۂ ارض اور علی الخصوص ہندوستان میں تقسیم

عمل نے ایسی بری صورت اختیار کرلی ہے کہ قوم کی قوم اپنی ذہانت کو کھو بیٹھی۔ اور وہ قوتیں جو قدرت کیطرف سے مختلف کاموں کے لیے عطا ہوئی ہیں. ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ اور انسان کے غیر محدود ذرایع کسب واکتساب فنا ہوجاتے ہیں میرا یہ نہیں کہنا کہ ہندوستان کی قوموں میں ذہانت کی کمی ہے یا وہ اس کے اہل نہیں ہیں یقیناً وہ ہم سے زیادہ اہل ہیں۔ اور ہم سے بہت زیادہ ذہین ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ کچھ کرتے نہیں، اور ہم سب کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ غافل ہیں اور ہم ہوشیار وہ کاہل ہیں اور ہم مستعد،

میں یہ بیان کرچکا ہوں۔ کہ کرہ ارض میں مسلمانوں کے انحطاط و زوال نے کیونکر تدریج کے ساتھ وہ تمام مراحل طے کئے ہیں، اور اب انکی حالت کیا ہے، اور اس کے بعد میں نے ان تدابیر کا ذکر کرنا شروع کیا تھا جن سے وہ قوم اپنے تئیں فنا ہونے سے بچا سکتی ہے، لیکن وہ تدابیر انہیں اسباب زوال سے متعلق ہیں کیونکہ ایک ایسی قوم کے لیئے جو زمانہ میں اسقدر گر گئی ہو۔ قابل غور امر یہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ کیونکر ترقی کرے، بلکہ سوال صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کیونکر اپنے موجودہ وزن کو قائم رکھ سکے۔ ایک مریض کے حق میں اولین تدبیر صحت یہ ہے کہ اس کی حالت اور زیادہ ردی نہ ہونے پائے، اور اس کا مرض ایک جگہ قایم ہوجائے۔ جو شخص بستر مرگ پر ہے وہ اٹھ کھڑا ہو، یہی غنیمت ہے۔ چلنے پھرنے کا خیال کسے ہوتا ہے، پس ہمیشہ ایسی صورتوں میں تمام تدابیر متعلق ہوتی ہیں اسباب زوال و انحطاط سے جسطرح اسباب مرض کا دفع ہوجانا مریض کی شفا ہے، اسیطرح اخلاق کی صحت ایک قوم کی صحت ہے، کیونکہ قوم کا ذلیل و برباد ہونا کچھ نہیں ہے۔ مگر اس کے اخلاق کا بگڑ جانا۔ اور صفات قومی کا معدوم ہوجانا۔ اس لیئے اگر کوئی شخص کسی قوم کی جان کو درست کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ اس کی اخلاقی حالت سے بے خبر ہے، سب سے پہلے اسطرف توجہ نہیں کرتا۔ تو سمجھ لو

رہ دیوانہ ہے اس کی کوششیں سب بے کار، وہ نہیں سمجھتا کہ کس چیز نے یہ انقلاب پیدا کیا۔ اور اس کو ان اصول کی خبر نہیں، کہ علت کا فقدان معلول کا فقدان اور اسباب کی برہمی کا نتیجہ انہدام ہے۔ سب سے بڑا اور حقیقی سبب میں اس قوم کے فنا ہو جانے کا بیان کر چکا ہوں کہ وہ ترک مذہبیت ہے۔ مذہب نہیں ان میں مذہب تو ہے، وہ مدعی بھی ہیں۔ کہ اسلام ان کا دین ہے، اور اس میں کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہبیت اُنکی مفقود ہو گئی ہے یعنی اقتضاء مذہب، داعیات دین اور حسیات قومی کیطرف سے انہوں نے یکسر روگردانی اختیار کر لی ہے۔ اور اس سے اس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں۔ کہ اب ان کے نزدیک مذہب کا حقیقی مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ کہ وہ اپنے تئیں صرف مسلمان کہتے ہیں، اور اگر ان سے پوچھو کہ اسلام کیا ہے۔ تو یقیناً وہ تمہارا منہ حیرت سے تکنے لگیں گے۔ کہ یہ کیا سوال ہے، ہمارے باپ دادا مسلمان تھے پیرو اسلام کہلاتے تھے۔ ہم اُنکی اولاد ہیں۔ اس لیے مسلمان ہیں، اور ہونا چاہیئے۔ بہرحال میں اسکو پہلے بیان کر چکا ہوں۔ لیکن اب میں اس کے جزئیات سے بھی ایک مختصر سی بحث کرنا چاہتا ہوں۔ کہ فقدان مذہبیت کے کیا کیا اثرات نتیجہ تھے،

سب سے پہلے حکومت کو لو، یہ میرے برادران ملک کو اچھی طرح معلوم ہو گا۔ کہ دنیا میں سوائے مسلمانوں کے کسی قوم کا مذہب ایسا نہیں جو سلطنت و حکومت کے لیے اس سے زیادہ موزوں ہو۔ اور اس کے لیے مجھے کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں، تاریخ شاہد ہے زمانہ گواہ ہے کہ اسلام کی ابتدا سلطنت کی ابتدا تھی۔ اور مسلمانوں کی ترقی حکومت کی ترقی تھی لیکن وہ سلطنت کیا تھی۔ اور حکومت کس انداز کی تھی۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ سلطنت امن اور حکومت جمہوری کا مصداق صحیح سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہوا اور نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ ترقی کیسی ترقی ہوتی۔ اور وہ امن کیسا امن ہوتا۔ اگر مسلمان کم از کم پانچ صدی تک اپنے اصول مذہب کو ترک نہ کرتے۔ اور اپنے ہادی کی ڈالی ہوئی

بنیاد کو متزلزل نہ کر دیتے۔ اب میں بیان کرونگا کہ سب سے پہلی وہ خرابی کیا تھی۔ جو اُس قوم میں پیدا ہوئی جب وقت نبی آخر الزمان نے مبعوث ہو کر لوگوں کو تعلیم مذہب و تلقین دین کا کام شروع کیا۔ اس وقت اس کا نصب العین صرف یہ تھا۔ کہ لوگوں میں ایک غرض مشترک کا خیال پیدا کر دیا جائے۔ یعنی تمام افراد قوم کی خواہشوں کا مرجع ان کی تمام آرزوؤں کا ہدف تمناؤں کا ملجاگاہ ایک اور صرف ایک قرار دیا جائے۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے، اور اس نوع کا خیال لوگوں میں پیدا کر دیا۔ وہ خیال کیا تھا؟ وہ نصب العین کیا تھا؟ وہ غرض مشترک کیا تھی؟ وہ غرض مشترک صرف خدمت قوم تھی۔ یعنی ہر شخص اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کہ وہ اپنے ابنائے جنس کی خدمت کرے۔ اور اپنی ذاتی اغراض کو بھول جائے۔ ان میں یہ مادہ پیدا کر دیا گیا تھا کہ بہ نسبت اپنی خواہشات کے دوسروں کی آرزوئیں پوری کر کے وہ زیادہ مسرور ہوں۔ یہ امر ان کے ذہن نشین کر دیا گیا تھا۔ کہ انسان محض اسی لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ دوسروں کے کام آئے۔ اور اپنے اغراض نفسانی پر دوسروں کی خواہشوں کو ترجیح دے۔

غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جس سلطنت کی بنیاد اس خیال پر قائم ہو۔ وہ کیسی سلطنت ہو سکتی ہے۔ اور اس کی وسعت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور جس نظام حکومت کے ارکان اس خیال میں مستغرق ہوں۔ وہ کس قدر ترقی کر سکتا ہے

تامل کرنے سے یہیں یہ بھی واضح ہو جائے گا۔ کہ جمہوریت کا صحیح مفہوم بھی اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ جب کسی قوم کے افراد میں یہ خیال پیدا ہو جائے۔ کیونکہ ہر فرد اپنے پاک اور بے لوث جوش خدمت کے لحاظ سے واقعی حق اس امر کا رکھتا ہے کہ وہ نظام حکومت میں برابر کا حصہ لے اور اس سچی آزادی اس حقیقی حریت کے ساتھ، جو صرف صداقت نفس سے پیدا ہو سکتی ہے ترقی قوم میں حصہ لے۔ اس کا نفع عظیم ایک طرف تو یہ ہوا۔ کہ سلامتی ضمیر اصابت رائے، صحت فکر، اور وسعت نظر پیدا ہوئی۔ جو

تمدن کی انتہائی ترقی کا باعث ہوسکتے ہیں، اور دوسری طرف جمہوریت کے ساتھ وہ اتفاق واتحاد قائم ہوا۔ جو سوائے اس صورت کے دوسری صورت میں ممکن ہی نہیں جیسا کہ تاریخ بھی بتاتی ہے، کہ جب جمہوریت کی شان کسی حکومت میں پیدا ہوئی۔ تو اسی کے ساتھ رفتہ رفتہ طوائف الملوکی بھی پھیلی اور اس طرح یہ جمہوریت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ لیکن چونکہ اسلام نے تمام افراد میں ایک غرض مشترک پیدا کردی تھی۔ اس لیے انکی جمہوریت ایک ایسا اتحاد تھا جس کی نظیر کہیں دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اور انکی آزادی ایک ایسا انقیاد تھا کہ کسی دوسری صورت میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس طرح اسلام نے حقیقتاً دو متضاد و متخالف عناصر کو اس نہج سے ملا دیا، کہ وہ یک جزو ہوکر رہ گئے، اور یہی وہ راز تھا جس کو اکثر تو سمجھ ہی نہیں سکے، اور جن قوموں نے سمجھا۔ وہ کوئی تدبیر ایسی اختیار نہ کرسکے جو اسلام کی طرح اطاعت و حریت دونو کو باہم ممزوج کرسکتے۔

الغرض سب سے پہلی برکت اسلام کی یہی تھی۔ اب دیکھیے، کہ رفتہ رفتہ اس میں کس طرح کمی ہوتی گئی، اور اس نے کیا صورت اختیار کرلی۔ جب نبی آخر الزمان اپنی عمر طبعی کو طے کرکے کرۂ ارض سے چلے گئے۔ تو ان کے بعد عہد خلافت شروع ہوا۔ یعنی ان کے خاص خاص احباب و مشیروں میں عنان سیادت منتقل ہوئی ہرچند وہ خصوصیت اسی عہد میں ضعیف ہو چلی تھی، لیکن چونکہ نبی آخر الزمان کے وصال کو ابھی زیادہ زمانہ نہ ہوا تھا۔ اس لیے بہت کچھ اثر قائم تھا۔ اور دفعتہً وہ زائل نہ ہوگئی۔ جن لوگوں نے اسلام کی تاریخ پڑھی ہے انہیں معلوم ہوگا۔ کہ رسول اللہ کے وصال کے بعد ہی دو گروہ ایسے پیدا ہوگئے۔ جو انتخاب خلیفہ میں دو مختلف رائیں رکھتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ یہ اختلاف سراسر اغراض شخصی پر منحصر تھا۔ لیکن بعض افراد یقیناً ایسے بھی تھے جن کے اندر یہ خیال بھی کام کر رہا تھا۔ اور ان کا اختلاف محض اسی بنا پر تھا۔ بہرحال ہوا وہی۔ جو

ہونا چاہیئے تھا۔ اور اسطرح اس پنہاں عناد و اختلاف کا کچھ بس نہ چلا۔ جو بعض افراد کے دلوں میں پایا تو جاتا تھا۔ لیکن زبان جمہور کے سامنے وہ بالکل ضعیف و مضمحل تھا اس وقت تک۔ اسلام میں اس حکومت و سلطنت کی بنیاد نہ پڑی تھی جو آیندہ چل کر قایم ہوئی اور جس نے اسلام کی تمام خصوصیات کو درہم برہم کر دیا۔ لیکن اس میں کلام نہیں۔ کہ اس کے آثار نبی آخر الزمان کی رحلت کے بعد ربع صدی کے اندر ہی اندر شروع ہو گئے تھے اور افسوس ہے کہ لوگوں نے ذرا توجہ اسطرف نہ کی۔ جب رفتہ رفتہ ایثار و نفس کشی کا خیال مسلمانوں کی قوم میں ضعیف ہوتا گیا۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر شخص نفس پروری کے ذرایع تلاش کرے اور اسطرح اس سلطنت کی بنیاد پڑی۔ جس کے بادشاہوں کا اخلاق گھٹتے گھٹتے اس درجہ پر پہنچ گیا جس کی بہتر نظیر ہم کو سلطنت ایران کے اخیر عہد میں مل سکتی ہے۔ ان کو نہ حکومت کی خواہش رہی نہ سلطنت کی۔ بلکہ وہ بدترین خود غرضی پیدا ہو گئی جو شاید کرہ ارض کے حیوانوں میں بھی نہ ملے گی۔ انہوں نے اپنی عزتیں قربان کر ڈالیں صرف اس لیئے کہ اس عزت کی قیمت انہیں ملتی تھی۔ انہوں نے خود اپنے مذہبی شعائر و دینی پیشواؤں کی بے حرمتی گوارا کی۔ محض اس خیال سے کہ شاید چند سکے زر انکی ہتھیلیوں میں آجائیں گے انہوں نے اپنے عزیزوں، اپنے احباب کا خون بہایا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے انہیں روپیہ قرض مل سکتا تھا۔ الغرض ان بادشاہوں نے وہ سب کچھ کیا۔ جو ایک ذلیل و حریص جانور کر سکتا ہے،

لیکن بایں ہمہ وہ اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکے۔ مگر افسوس اسپر نہ تھا۔ کہ انہوں نے ایسا کیا۔ بلکہ حسرت تو اس امر پر تھی۔ کہ دنیا کے مسلمانوں نے پھر بھی کوئی سبق حاصل نہ کیا، اور وہ نہ سمجھے کہ دنیا میں کسی قوم کی عزت نہیں ہو سکتی۔ جب تک خود اس کے اندر ایثار خودداری نہ پایا جائے۔ اور کبھی یہ ممکن نہیں جب تک اغراض

نفسانی کی قربانی دوسروں کے لیئے نہ کردیجائے، ہر چند اس دور کے بعد وقت ایسا آیا تھا کہ مسلمانوں میں کچھ جد و جہد کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ سنبھل جائیں گے۔ لیکن زمانہ نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ کوشش انکی بالکل بے سود تھی۔ اور وہ اضطراب، اضطراب فنا تھا، جو معدوم ہونے کے وقت ردعمل کے زیر اثر تمام جسموں میں پایا جاتا ہے

میں اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ وہ کوششیں کیا تھیں، جو مسلمانوں نے کیں۔ اور وہ کس قدر بے اصول تھیں۔

تعلیم ان کی غلط اصول پر قائم ہوئی۔ سیاست میں انہوں نے اپنے ذریت ثانی سے دھوکا کھایا۔ معاشرت وہ اپنی درست نہ کر سکے۔ اخلاق کیطرف ان کو توجہ نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے لاکھوں روپیہ علیگڑھ کالج میں صرف کیا۔ گریجویٹ سو دو سو پیدا کر لئے لیکن جہل سے ایک قدم آگے نہ بڑھایا۔ اور ان کی دوسری رقیب قوم نے سب کچھ کر لیا۔ میں نہیں کہتا۔ کہ وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کا مرض علاج کی گذر چکا ہے۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ سخت دشوار اور بظاہر کوئی امید ان کے سنبھلنے کی نہیں ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ اپنے تمام دوران سیاحت میں میں نے کسی قوم کو اس حالت غربت و ذلت میں بھی اس قدر قابل التفات نہ پایا۔ میرا کبھی جی چاہا۔ کہ کاش یہ قوم میرے ملک میں ہوتی۔ کاش ان میں سے دو ہی چار ہمارے کرہ کی حالت اور اس کا انتظام دیکھتے، اور درس حاصل کرتے، لیکن آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں، کہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ اور غالباً یہی سب سے بڑا نقص ہے۔ جو ہم اپنی ترقی میں محسوس کرتے ہیں، میں نے اپنے عہد سیاحت میں اسطرف ہی کامل توجہ کی۔ کہ ان لوگوں سے کچھ گفتگو کر سکوں، اور ان کو اپنا مافی الضمیر بتا سکوں لیکن کرہ ارض کا باشندہ کسی مفہوم کے اخذ کرنے کے لیئے مجبور ہے۔ کہ پہلے کوئی چیز اس کے کانوں کو متاثر

کر سکے، اور پھر وہ دماغ سے کام لے کر اس کا مطلب معلوم کرے، اور افسوس ہے کہ میں ان کے سامنے پر کسی چیز سے اثر ڈال سکتا تھا۔ اور اگر اس میں کامیاب ہو جاتا تو کیونکر ممکن تھا۔ کہ وہ میری زبان کو جو زیادہ تر حرکات و اشارات کی زبان ہے، آسانی سے سمجھ سکیں گے۔

ہر چند مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ بیان ان کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ اول تو یہ ان تک پہنچ ہی نہیں سکتا، اور اگر پہنچ بھی جائے، تو بھی کیا امید ہے، کیونکہ جس قوم نے اپنے مذہب کی زندہ کتاب اور اس کی تعلیمات کو بھلا دیا، وہ ایک سیاح کے بیان کی کیا وقعت کر سکتی ہے، لیکن حقیقتاً اس سے مقصود ان کو فائدہ پہنچانا نہیں ہے، بلکہ اپنی قوم کے لئے سرمایۂ عبرت و فکر مہیا کرنا ہے، تاکہ وہ غور کریں۔ اور سمجھیں کہ قوموں کے عروج و زوال میں کیسی کیسی معمولی باتوں سے انقلاب عظیم پیدا ہو چکا ہے، مگر اس لحاظ سے کہ مجھے اور میری تمام قوم کو مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہے،

میں آخر میں خود بھی دعا کرتا ہوں، اور آپ لوگوں سے بھی ہم آہنگ ہونے کی التجا کرتا ہوں۔ کہ اس وقت جب آپ لوگ اپنی دعائے نیم شبی کے لئے آمادہ و تیار ہوں قوم کو فراموش نہ کریں۔ اور درگاہ رب العزت میں التماس کریں کہ خدایا! تیرے حیطۂ اختیار و قدرت سے یہ کسی طرح باہر نہیں، کہ گرے ہوؤں کو سنبھال لے جس طرح تو عقلیں چھین سکتا ہے، اسی طرح تو دے بھی سکتا ہے، اس لئے مسلمانوں پر رحم کر، ان کو وہی راستہ دکھا۔ جو تو نے پہلے دکھایا تھا۔ اور ان کو توفیق عطا کر کہ تیرے احکام کی پابندی کریں۔ اور وہی کریں، جو تو نے اپنے رسول آخر الزماں کے ذریعہ ان تک پہنچایا تھا،

شامِ زندگی

زندگی کی بہار ہندوستان میں صدیوں سے خزاں رسیدہ ہوتی جاتی ہے خلقت جی رہی ہے مگر مرنے سے بدتر ہو جینے کی بنیاد گھرداری پر ہے اور گھرداری عورت کا دوسرا نام ہے، عورت کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی آدمیت کا حس کھو چکی ہے، مرد کی طلب پست کو بھی سہتی ہے، مرد روتے ہیں، عورت حیوان ہیں عورت کہتی ہے مگر نادان ہیں، نہ ان کو صبح زندگی کی خبر اور نہ ان کو شامِ حیات سے سروکار مولانا راشد الخیری دہلوی نے قلم اٹھایا اور صبح زندگی کا خاکہ کھینچ کر دکھا دیا کہ آج زندگی گزاری گرسنہ ہو جینے کی ابتدائی بہار کیوں ہوتی ہے عورتوں نے مردوں نے جو اس خاکہ کو جس کا نام صبح زندگی تھا، دیکھا پڑھا، تو جانا کہ زندگی شروع کرنیکا ہم سب کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو کتاب صبح زندگی میں ہے، مولانا راشد زندگی کو دوپہر کی دھوپ میں چھوڑ کر چپ ہو گئے تو ہند کے چاروں کھونٹ سے آوازیں آئیں کہ زندگی کو شام تک پہنچاؤ، ادھر بیچ میں نہ چھوڑو، انھوں نے قلم برق رقم پر انگلی رکھ دی، اور شامِ زندگی چھپ کر نمودار ہو گئی، شامِ زندگی کتاب ہے، اور صبح زندگی سے زیادہ لاجواب ہے، عورتیں اس کتاب کو پڑھ لیں، تو ان کی زندگی مزیدار ہو جائے اور مردوں کی زندگی بھی بہشت بن جائے، شامِ زندگی ایک دلچسپ قصہ ہے، اردو قلم کا شاہکار ہے، بے نظیر اردو کا سمندر ہے، جو پڑھے، ہنسے، روئے، مزے لے، پھر تڑپے، پھر سوچے، اور بے اختیار ہو کر پھر پڑھے، کسی طرح جی نہ بھرے، یہ عجیب جادو اس کتاب میں ہے اور تاثیر کی یہ حالت ہے کہ پڑھنے والا اپنے کو وہی تصور کرتا ہے، زندگی کے نقص محسوس کرتا جاتا ہے، اس کی اصلاح کی تدبیر پڑھنے والے ذہن میں صاف صاف شروع کر دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ داستان تو مصنف خیری نے مجھ پر چوٹ کی ہے یہ ہے کہ عقل شعار عورتوں نے عورتوں کو پڑھکر کتاب لکھی ہے، شامِ زندگی ہر گھر میں زندگی پیدا کر دیگی، اس کو پڑھ کر عورتیں اپنے فرائض جان جائینگی، اور اشرف شریفوں کی طرح نیک بیبیوں کی مانند، اور سلیقہ مند گھر والی کی مثل خاوند کا دل موہنا، اور سارے کنبہ، سارے شہر، ساری قوم اور سارے ملک کی واہ واہ حاصل کرنا آجائیگا، کتاب شامِ زندگی عورتوں سے زیادہ مردوں کو مفید ہوگی، کیونکہ مرد اگر عورتوں کے طریقہ حیات اور جذبات سے آگاہ ہوں گے تو ان کے گھروں میں بہشت اتر آئے گی، اور وہ سمجھیں گے کہ زندگی اس کا نام ہے، شامِ زندگی مولانا راشد الخیری کی بہترین تصنیف ہے، شامِ زندگی اردو ادب کی لاجواب نشانی ہے، شامِ زندگی اصلاحِ معاشرت کی اثردار استانی ہے، شامِ زندگی دلی کی آواز ہے جس سے اس مردہ شہر کی حیات کا ثبوت ملتا ہے، آپ خریدیئے، گھر کے لیے منگائیے، بچوں کو لے کر دیجئے، دوستوں میں تقسیم فرمایئے، زندگی کو زندہ کیجئے، دیکھیئے دیکھئے، اس کتاب کا جینا جلانا، جاگنا جگانا، پھسلانا، اور باتوں باتوں میں دل کے اندر اتر جانا دیکھئے، اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ختم کے قریب ہے قیمت ۱عہ

مینیجر اخبار خطیب دہلی سے طلب فرمایئے